اکتوبر ۱۹۹۲ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعتِ خصوصی

• جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران

• پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور دینی جماعتیں

• مولانا مودودی مرحوم اور میں

از
ڈاکٹر اسرار احمد

مع ضمیمہ بشکریہ ہفت روزہ تکبیر کراچی

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

اس شمارے کی قیمت دس روپے

جماعت اسلامی

○ اس کے اساسی نظریات کیا تھے؟
○ ان میں تبدیلی کب اور کیسے شروع ہوئی؟
○ جماعت کے پہلے بحران (۴۳ء) کی نوعیت کیا تھی؟
○ دوسرے اور شدید تر بحران (۵۷-۵۶ء) کے اصل حقائق اور اسباب کیا تھے؟
○ جماعت کی اس تبدیلی نے اقامت دین کی تحریک کے علاوہ خود پاکستان کو کیا نقصان پہنچایا؟

ان سوالات کے جواب —— اور اس عظیم تحریک کو تباہی سے بچانے کے آخری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے

ڈاکٹر اسرار احمد

کی حسب ذیل تصانیف کا مطالعہ لازمی ہے

۱) تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ (صفحات ۲۳۶)

۲) تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب (صفحات ۳۲۸)

۳) اسلام اور پاکستان (صفحات ۹۸)

تینوں کی مجموعی قیمت: سفید کاغذ پر مجلد -/۱۲۰ روپے' اخباری کاغذ پر غیر مجلد -/۸۰ روپے

(محصولڈاک -/۱۵ اس کے علاوہ)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

سے طلب فرمائیں یا تنظیم اسلامی کے مقامی دفاتر سے حاصل کریں۔

(نوٹ: وی پی صرف نصف رقم کا پے آرڈر موصول ہونے پر ارسال کی جائیگی)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اُوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۱
شمارہ: ۱۰
ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
اکتوبر ۱۹۹۲ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، مسقط، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ امریکی ڈالر

توسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

یکے از مطبوعاتِ تنظیم اسلامی، مرکزی دفتر: ۶۷ - اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

پبلشر: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اس شمارے میں!

زیرِ نظر شمارہ کی حیثیت ایک خصوصی اشاعت کی ہے۔ جماعت اسلامی اپنی تاریخ کے جس شدید ترین بحران سے دوچار ہے اس کے پیش نظر بعض اہم مضامین اس پرچے میں شامل کیئے گئے ہیں۔ ہمارا چونکہ شروع سے یہ موقف رہا ہے کہ موجودہ صدی میں اقامتِ دین کے لئے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر اٹھنے والی واحد انقلابی جماعت یہی جماعتِ اسلامی تھی' جو اگرچہ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد اپنے اصولی موقف پر قائم نہ رہ سکی اور انتخابی سیاست کے میدان میں کود کر منزل سے بتدریج دور ہٹتی چلی گئی تاہم اس کی اٹھان چونکہ صحیح رخ پر تھی لہٰذا اقامتِ دین کے میدان کی اس اکلوتی جماعت کی تاریخ اور اس کے اتار چڑھاؤ سے ہمیں خصوصی دلچسپی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہماری دلچسپی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد کے تحریکی سفر کا آغاز بھی اسی جماعت سے ہوا اور خود ان کے بقول انہوں نے اپنے شعور کی آنکھ اسی تحریک کی گود میں کھولی اور اسی سے اکثر و بیشتر فکری غذا حاصل کی۔ ہماری دانست میں یہ جماعت تو اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہے لیکن اسکی نصف صدی کی تاریخ میں غلبہ و اقامتِ دین کے لئے کام کرنے والی دیگر تحریکوں اور تنظیموں کے لئے سبق آموزی کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔

زیرِ نظر شمارہ کم و بیش کُل کا کُل امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا مرتب کردہ اور انہی کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ صرف اس شمارے کے آخری حصہ کا معاملہ مختلف ہے جو "ضمیمہ" کے عنوان سے شامل اشاعت کیا گیا ہے' کہ وہ ہفت روزہ "تکبیر" سے ماخوذ چند مضامین پر مشتمل ہے---- پہلے حصے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے وہ مضامین شامل ہیں جو "جماعت اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران" کے عنوان سے حال ہی میں نوائے وقت میں شائع ہوئے ہیں۔

دوسرے حصے میں جس کا عنوان "پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور دینی جماعتیں" ہے محترم ڈاکٹر صاحب کی تین تحریریں شامل کی گئی ہیں: i) پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار ii) قیام پاکستان اور مذہبی طبقات کی ذمہ داریاں اور iii) پاکستان سیکولرزم اور فنڈا مِنٹلزم کے فیصلہ کن دوراہے پر! ان میں سے پہلی دو میں زیادہ تر اصولی بحث کی گئی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مذہبی جماعتوں کا کردار کیا ہونا چاہیے 'تھا' بالفعل ان کا کردار کیا رہا اور اس کے کیا نتائج ظاہر ہوئے اور تیسری تحریر پاکستان کی موجودہ ملی و سیاسی صورت حال کے مبسوط تجزیے پر مشتمل ہے۔

تیسرے حصے میں جس کا عنوان ہے "مولانا مودودی مرحوم اور میں" ---- محترم ڈاکٹر صاحب کے ان دو مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو آج سے دس سال قبل ستمبر ۸۲ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات کے موقع پر ان کے قلم سے نکلے تھے۔ یہ سلسلۂ مضمون نامکمل رہا اور محض دو اقساط کی اشاعت کے بعد جاری نہ رہ سکا تھا--- ابھی حال ہی میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کو مکمل کرنے کے لئے پھر قلم اٹھایا ہے اور خیال ہے کہ اس بار یہ سلسلۂ مضمون اللہ نے چاہا تو پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ تازہ تحریر شدہ مضمون کا ابتدائی حصہ بھی شامل اشاعت ہے---- شمارہ ہذا کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کیا گیا ہے جو ہفت روزہ تکبیر سے ماخوذ بعض مضامین پر مشتمل ہے جن سے جماعت کے حالیہ بحران کی نوعیت اور شدت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے!

تذکرہ وتبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران

جماعتِ اسلامی پاکستان کے داخلی خلفشار اور اس کے چوٹی کے قائدین کے باہمی اختلافات کی شدت اور حدت بالکل غیر متوقع طور پر نہایت غیر معمولی انداز میں اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ بات بند کمروں اور جماعت کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے اجلاسوں' یا جماعت کے اراکین اور کارکنوں کی باہمی گفتگوؤں کے دائرے سے نکل کر ہفت روزہ جرائد اور ان سے بھی آگے بڑھ کر روزناموں کے صفحات تک پہنچ گئی ہے۔ گویا یہ مسئلہ اب "پبلک پراپرٹی" بن چکا ہے اور اس پر اظہارِ خیال ہرگز "دخل در معقولات" کے ذیل میں نہیں آتا۔ اور ایک طرف عوام کا حق ہے کہ انہیں اس اختلاف کی نوعیت اور اس کے پس منظر سے واقفیت بہم پہنچائی جائے' اور دوسری طرف چونکہ جماعتِ اسلامی صرف ایک عام مذہبی جماعت نہیں احیاءِ اسلام کی عالمی تحریک میں اہم مرتبے اور حیثیت کی حامل ہے' لہٰذا دین و مذہب کے ہر بہی خواہ اور خاص طور پر پاکستان میں اسلام کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے ہر باشعور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حدیث نبویؐ "دین تو اصلاً نصیحت اور خیر خواہی ہی کا نام ہے[1]" کے مطابق جماعت کے ارباب حل و عقد اور سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو مقدور بھر صحیح مشورہ دے! اور جماعت کے رہنماؤں اور کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ بھی نبیِّ اکرمؐ کے ان اقوالِ مبارکہ پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کریں کہ "یہ دیکھا

---

[1] اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَۃُ (رواہ مسلم' عن تمیم الداریؓ)

کرو کہ کیا کہا جارہا ہے' یہ نہ دیکھا کرو کہ کہنے والا کون ہے[1]! " اور "جو بات صائب اور ستھری ہو قبول کرلو' جو غلط یا غیر واضح ہو اسے چھوڑ دو[2]! "

ایک داعی کی دعوت کی اساس پر قائم ہونے والی جماعت

جماعتِ اسلامی کے بارے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی ضروری ہے کہ یہ ان اداروں' تنظیموں اور جماعتوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو کسی سماجی یا قومی "ضرورت" کے احساس کے تحت وجود میں آتی ہیں' اس لئے کہ کسی سماجی یا قومی ضرورت کا احساس بیک وقت بہت سے لوگوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر کسی ادارے یا انجمن (جیسے انجمن حمایت اسلام لاہور) یا قومی و سیاسی جماعت (جیسے مسلم لیگ) کا قیام عمل میں لاتے ہیں اور پھر اپنے میں سے اس کے عہدیداروں کا انتخاب کرتے ہیں' چنانچہ یہ عہدیدار وقتاً فوقتاً بدلتے بھی رہتے ہیں ----- اس کے برعکس ایک جماعت وہ ہوتی ہے جو کسی "مفکر" کے افکار و نظریات اور کسی "داعی" کی دعوت کی اساس پر وجود میں آتی ہے' لہٰذا اس قسم کی جماعت میں داعی کی پکار پر لبیک کہنے والوں کی حیثیت اس کے "اعوان و انصار" کی ہوتی ہے اور داعی کی حیثیت ان کے فطری قائد اور مستقل امیر کی' اور خواہ رسمی طور پر تین سالہ یا پانچ سالہ انتخاب کا تکلّف کر بھی لیا جائے' جب تک وہ داعی اور مؤسس موجود رہتا ہے کوئی دوسرا شخص امیر ہو ہی نہیں سکتا' اِلّا یہ کہ وہ داعی اور مؤسس خود کسی سبب سے زمام کار اپنے کسی معتمد ساتھی کے حوالے کردے اور خود اس کی سرپرستی اور رہنمائی کرتا رہے!----- مزید برآں یہ جماعت صرف اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک داعی کے اساسی نظریات برقرار ہیں۔ بصورت دیگر اس کا شیرازہ منتشر ہونا لازمی ہے۔ اِلّا یہ کہ داعی اپنی زندگی ہی میں خود کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنی چاہے!---- ظاہر ہے کہ جماعتِ اسلامی اسی مؤخر الذکر قسم کی جماعت ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ

---

[1] انظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال

[2] خُذ ما صَفا دَع ما کدر

مودودی مرحوم کے افکار و نظریات اور ان کی دعوت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی اور مولانا مرحوم اس کے داعی بھی تھے اور بانی و مؤسس بھی، اور فطری قائد بھی تھے اور مستقل امیر بھی! لہٰذا جماعت کے بارے میں کوئی رائے مولانا مودودی کی ذات اور شخصیت کو علیحدہ رکھتے ہوئے قائم نہیں کی جا سکتی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم: شخصی اور تاریخی پس منظر

مولانا مودودی کی ولادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی اور ایک ذہین، حساس، باہمت اور حوصلہ مند نوجوان کی حیثیت سے وہ جن دو عظیم شخصیتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں سے ایک تو ان سے عمر میں پندرہ سال بڑے مولانا ابوالکلام آزاد تھے اور دوسرے ان سے بھی دس سال بڑے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ چنانچہ علامہ اقبال کے زیر اثر وہ جذبۂ ملی سے سرشار اور مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و تمدن کے بالمقابل قرآن کے فلسفہ و حکمت اور "اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی[۱]" سے فیضیاب ہوئے اور "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام کے زیرِ اثر دعوت الی القرآن اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین کی محبت میں گرفتار اور اسلام کے احیاء اور دین کی تجدید کے جذبے سے سرشار ہوگئے۔

اپنی عملی زندگی کا آغاز انہوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے کیا جس کا ابتدائی تجربہ جمعیت علماءِ ہند کے آرگن "الجمعیت" کی ادارت سے منسلک ہو کر حاصل کیا ـــــ اور پھر ۱۹۳۳ء میں تیس برس کی عمر میں اپنی ذاتی اور آزادانہ حیثیت میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے ذریعے اپنے افکار و خیالات کی اشاعت شروع کی۔ اور اپنی سلیس زبان، شائستہ اسلوب، اور سلجھے ہوئے انداز کے ذریعے بہت جلد تہذیبِ جدید کے مقابلے میں دین و شریعت کی مدافعت اور اسلام کے نظامِ حیات کے مختلف پہلوؤں کی عام فہم اور دلنشین تشریح اور توضیح کے میدان میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی حیات ملی کے بحرِ محیط میں جو

---

[۱] مولانا مودودی کی ایک ابتدائی تصنیف کا عنوان

مختلف سیاسی روئیں اس وقت چل رہی تھیں ان کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اور اس سلسلے میں اولاً ان لوگوں پر شدید اور مدلل تنقید کی جو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل سے آگے بڑھ کر "متحدہ قومیت" تک کے تصور کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ان کی اس تنقید نے انہیں مسلمانانِ ہند کے سوادِ اعظم کے جذبات اور احساسات کا "ترجمان" اور ان لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنادیا جو مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کے علمبردار اور ان کے قومی مفادات اور سیاسی حقوق کی نگہداشت اور تحفظ کے لئے کوشاں تھے--- اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال کی نگاہ ان پر پڑی جنہوں نے انہیں حیدر آباد (دکن) سے پنجاب منتقل ہونے کی دعوت بھی دی اور اس سلسلے میں اپنے ایک نیاز مند چودھری نیاز علی خان مرحوم کے ذریعے تعاون بھی کیا۔

لیکن اس کے بعد بہت جلد مولانا نے اپنے آپ کو مسلمانانِ ہند کے مجموعی قومی دھارے سے علیحدہ کرلیا۔ اور "مسلم قوم پرستی" کو بھی خلافِ اسلام قرار دے کر اسلام کے خالص اصولی اور ٹھیٹھ نظریاتی بلکہ "انقلابی" موقف کا پرچار شروع کردیا۔ اور ایک "قومی جماعت" کے بالمقابل ایک "صالح جماعت" کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے قیام کی زور دار دعوت دی۔ مولانا کے یہ مضامین ۴۰-۱۹۳۹ء کے دوران "ترجمان القرآن" کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے ---- اور صرف تاریخی خاکے کی تکمیل کے لئے نوٹ کرلیا جائے کہ (i) علامہ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوچکا تھا۔ اور (ii) "قراردادِ پاکستان" ۱۹۴۰ء میں پاس ہوچکی تھی ----

جماعتِ اسلامی کے تاسیسی نظریات

بہر حال مولانا کے ان افکار و نظریات کے ساتھ کامل اتفاق کرتے ہوئے اور ان کی دعوت پر لبیک کہہ کر جو لوگ اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور میں جمع ہوئے ان پر مشتمل جو جماعت "جماعتِ اسلامی" کے نام سے وجود میں آئی اس کے اساسی موقف اور تاسیسی نظریات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریۂ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کلی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

۲۔ عبادت صرف مراسمِ عبودیت کا نام نہیں' بلکہ اس نظام کی کلی اطاعت کا نام ہے جو زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام گوشوں پر حاوی ہونی چاہئے۔

۳۔ مسلمان قوم نہیں' امت مسلمہ اور حزب اللہ ہیں۔ اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت کی ہے جس کا اولین مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے۔

۴۔ دنیا کے موجودہ غیر مسلم قانوناً تو کافر ہیں لیکن ان کی اکثریت کو حقیقۃً کافر قرار نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا رد کر دینے کا سوال پیدا ہو۔

۵۔ اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بھی صرف قانونی اور نسلی مسلمانوں پر مشتمل ہے' نہ کہ حقیقی مسلمانوں پر۔ اس لئے کہ نہ ان کے قلوب و اذہان میں اسلام کی نظریاتی اور اعتقادی اساسات راسخ ہیں' نہ ان کے عمل میں اسلامی قانون کی پابندی اور شریعت کا التزام ہی پایا جاتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفظ اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت یا ان کی آزادی اور خود مختاری کے حصول کی جدوجہد کا اسلام کی نشأۃ ثانیہ یا احیائے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اولاً ——— بلالحاظ مذہب و ملت پوری نوعِ انسانی کو بندگیٔ رب کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور ——— پھر سابق غیر مسلموں میں سے جو لوگ اسلام کو قبول کرلیں اور نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرمادے ——— ان کی قوتوں کو ایک ہیئتِ

تنظیمی کے تحت مجتمع کر کے غلبۂ دینِ حق یا حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی منظم جدوجہد کی جائے۔

۸۔ اس جدوجہد میں اولین اہمیت علمی و فکری انقلاب کو حاصل ہے، پھر عملی و اخلاقی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کو۔ نظامِ حکومت کی تبدیلی کا مرحلہ ان سب کے بعد آتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدت تو موجود ہے اور اب اس امر پر صرف افسوس اور حسرت کا اظہار ہی کیا جاسکتا ہے کہ کاش مولانا مودودی خود تو ان اعلیٰ نظریات پر کار بند رہتے اور اپنے بلند تر نصب العین کے حصول کی سعی کو جاری رکھتے لیکن مسلمانوں کے قومی تشخص کے تحفظ اور ان کے لئے حقِ خود اختیاری کے حصول کی جد و جہد کو بھی "خلافِ اسلام" قرار نہ دیتے--- اور تحریکِ پاکستان کے آخری اور فیصلہ کن ایام میں مسلم لیگ اور اس کی قیادت پر دلآزار تنقیدیں نہ کرتے، اس لئے کہ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ گواہ ہے کہ اگرچہ کسی بگڑی ہوئی مسلمان قوم میں "کرنے کا اصل کام" تو یقیناً یہی ہوتا ہے کہ اس کی دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کی سعی کی جائے لیکن اسے غلامی کے شکنجے سے نجات دلانا اور آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرنا بھی ہرگز کوئی غلط یا گھٹیا کام نہیں ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف وہی ہے جو مولانا مودودی نے پیش کیا تھا اور مسلمانوں کی دنیوی فلاح و بہبود اور ان کے سماجی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس خالص اصولی اساس پر کسی احیائی تحریک کا اٹھنا وقت کی اہم ضرورت تھی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاتھوں پوری ہوئی اور ع "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے" کے مصداق داد دی جانی چاہئے کہ مولانا موصوف اور ان کے رفقاءِ کار حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم اور ہر طرح کے طعن و طنز اور تمسخر و استہزاء کے باوجود مسلسل چھ سال تک اس موقف پر ڈٹے رہے۔ اس طرح گویا وہ کام جسے

احیائے اسلام کے "راست اقدام" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جس کا ابتدائی خاکہ "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام نے تیار کیا تھا' عملاً مولانا مودودی کے ہاتھوں شروع ہوا۔

پہلا بحران اور اس کی نوعیت

اپنے یوم تاسیس سے قیام پاکستان تک کے چھ سالوں کے دوران جماعتِ اسلامی ایک بحران سے تو ۱۹۴۳ء ہی میں دو چار ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں مولانا محمد منظور نعمانی' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' اور مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی (مرحوم) ایسے اکابر کے علاوہ جماعت کے اس وقت کے کل اراکین کی ایک تہائی تعداد جماعت سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ اور ایک دوسرے بحران کا اندیشہ ۱۹۴۶ء میں پیدا ہو گیا تھا جو مولانا مودودی کی "حکمتِ عملی" کے باعث ٹل گیا۔ لہٰذا کسی کی علیحدگی کی نوبت نہیں آئی۔

۱۹۴۳ء میں' یعنی جماعت کے قیام کے دو ہی سال بعد جو شدید بحران جماعت میں پیدا ہوا تھا اس کی بنیاد نہ کسی نظریاتی تصادم پر تھی نہ طریقِ کار یا پالیسی کے بارے میں آراء کے کسی اختلاف پر۔ بلکہ اس کی نوعیت خالص شخصی اور ذاتی تھی۔ یعنی متذکرہ بالا اکابر اور ان کے ہم خیال ارکان کی رائے دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں مولانا مودودی کے ذاتی حالات اور معمولات کے قریب سے مشاہدے کے بعد یہ بنی کہ جتنے اعظم و اعلیٰ مقصد' اور بلند و بالا نصب العین کے لئے جماعت اسلامی قائم ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر مولانا مودودی اپنی ذات اور شخصیت' بالخصوص تقویٰ اور تدین کے اعتبار سے اس کی قیادت اور امارت کے اہل نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ منصب اور ذمہ داری کسی اور کو سونپ دی جائے تو نہ تو فی الواقع کوئی دوسرا ایسا شخص موجود ہی ہے جو اس کی اہلیت کا حامل ہو' نہ ہی یہ جماعت مولانا مودودی کے سوا کسی اور شخص کی امارت میں چل سکتی ہے! گویا علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کو نہ مولانا مودودی کے افکار و نظریات سے کوئی اختلاف پیدا ہوا تھا نہ ہی

"ایک صالح جماعت" کی ضرورت اور اس کے مطلوبہ خصائص اور اوصاف کے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی آئی تھی بلکہ علیحدگی کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کام کی قیادت اور امارت کے لئے مطلوبہ اوصاف کی حامل کوئی شخصیت موجود نہ تھی ـــــ اور چونکہ یہ سبب خالص منفی تھا، اور معقول اور مثبت بات یہی تھی کہ "انسان کامل" اور "مردے از غیب" کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہا جائے بلکہ جیسی کچھ صلاحیتیں بھی فی الوقت میسر اور دستیاب ہیں ان ہی کے ذریعے کام جاری رکھا جائے، لہٰذا قافلہ رواں دواں رہا اور مخلص، محنتی، اور ایثار پیشہ کارکنوں کی اچھی بھلی تعداد جماعتِ اسلامی کے جھنڈے تلے جمع ہوتی چلی گئی۔

ایک دستوری اختلاف اور اس کا حل

البتہ دوسرا 'بحران' جو ۱۹۴۶ء میں جماعت کے سالانہ اجتماع منعقدہ الہ آباد (یو پی۔ انڈیا) کے موقع پر پیدا ہوا لیکن ع "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!" کے مصداق مولانا مودودی کی حکمت عملی کے باعث بروقت ٹل گیا، جماعت کے نظام اور اس میں امیر کے اختیارات کے بارے میں اختلافِ رائے کی شدت سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے کہ مولانا مودودی اس رائے کے حامل تھے کہ جماعت کے امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کو مسترد کرنے کا حق یعنی "ویٹو" کا اختیار حاصل ہونا چاہئے جبکہ بعض دوسرے اہم حضرات بالخصوص مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے یہ تھی کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا "پابند" ہونا چاہئے۔ اور اس مسئلے پر بحث میں اتنی شدت پیدا ہوگئی تھی کہ یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ جماعت کا شیرازہ بالکل منتشر ہوجائے یا کم از کم جماعت منقسم ہوجائے۔ لیکن عین وقت پر مولانا مودودی نے حالات کے تیور دیکھتے ہوئے مصالحت کی راہ اختیار کرلی اور اس "مصالحتی فارمولے" پر اتفاق ہوگیا کہ ـــــ اگر کسی مسئلے پر جماعت کے امیر اور اس کی مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مابین اختلاف پیدا ہوجائے اور دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر جازم اور مصر ہوجائیں تو فیصلہ جماعت کے عام ارکان سے استصواب کے ذریعے کیا جائے گا۔

چنانچہ اگر جماعت کی اکثریت امیرِ جماعت کی رائے کو صائب قرار دیدے گی تو شوریٰ معزول ہو جائے گی اور اس کا انتخاب دوبارہ ہو گا اور اگر صورت برعکس ہوئی تو امیر معزول ہو جائے گا اور اس کی جگہ نیا امیر منتخب کیا جائے گا —— اور اگرچہ جماعتِ اسلامی کی مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر یہ فارمولا مہمل تھا' اس لئے کہ مولانا مودودی اس جماعت کے "فطری امیر" تھے اور یہ جماعت ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کی امارت میں چل ہی نہیں سکتی تھی' تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ بحران ٹل گیا اور قافلہ منتشر ہونے سے بچ گیا۔

——(۲)——

دوسرا بحران اور اس کی نوعیت

جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا دوسرا اور شدید تر بحران ۵۷-۱۹۵۶ء میں پیدا ہوا تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف مولانا امین احسن اصلاحی جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے جنہیں سترہ سال تک جماعت میں متفقہ طور پر مولانا مودودی کے نمبر دو کی حیثیت حاصل رہی تھی (یہی وجہ ہے کہ بعض مبصرین انہیں مولانا مودودی کا اینجلز قرار دیتے تھے اور بعض حکیم نور الدین سے تشبیہ دیتے تھے) بلکہ ان بقیہ تینوں حضرات نے بھی علیحدگی اختیار کر لی جن پر مختلف اوقات میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کی نظر بندی کے دوران جماعت کی امارت کی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جاتا رہا تھا یعنی مولانا عبد الجبار غازی (مرحوم)' مولانا عبد الغفار حسن' اور شیخ سلطان احمد۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس وقت کی مرکزی مجلس شوریٰ کی تقریباً ایک تہائی تعداد' اور بہت سی دوسری اہم شخصیتوں کے علاوہ جن میں نمایاں ترین نام جناب سعید ملک اور حکیم عبد الرحیم اشرف کے ہیں' جماعت کے عام اراکین کی بھی ایک معتدبہ تعداد نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی جن میں تین اشخاص وہ بھی شامل تھے جو آج مختلف اعتبارات سے معروف ہیں یعنی جناب مصطفیٰ صادق' جناب ارشاد احمد حقانی' اور خود راقم الحروف!

جماعت کا یہ دوسرا بحران پہلے بحران سے اس اعتبار سے بالکل مختلف تھا کہ اگرچہ اس میں بھی کچھ شخصی معاملات زیرِ بحث آئے' اور بعض معین عملی اقدامات بھی اختلافات میں شدت اور تلخی کے موجب بنے' لیکن اصل وجہِ نزاع جماعت کی بعد از قیامِ پاکستان پالیسی اور طریقِ کار تھا۔ لہٰذا اس کے تاریخی پس منظر پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جماعتِ اسلامی کی عملی جدوجہد کے اس دور کا آغاز ہوگیا تھا جسے مولانا مودودی نے اپنی تالیف: "جماعتِ اسلامی کی تاریخ' مقصد اور لائحہ عمل" میں "توسیع اور عملی اقدام" سے تعبیر کیا ہے۔ اور جسے "یکلخت" قرار دیتے ہوئے اس کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ "جس روز تقسیمِ ملک کا اعلان ہوا اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بھی بری یا بھلی تعمیر ہم آج تک کرسکے ہیں اب اس پر اکتفا کرنی ہوگی' اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی اصلاح کے بغیر یکلخت بااختیار ہوگئی ہے۔"

یہ تبدیلی اس اعتبار سے تو خوش آئند قرار دی جاسکتی ہے کہ مخلص و مستعد' اور منظم اور ایثار پیشہ کارکنوں کی ایک جمعیت جو قوم کے مجموعی دھارے سے کٹی رہی تھی اب ع " آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!" کے مصداق دوبارہ اس میں شامل ہوگئی' لیکن اس سلسلے میں جن دو خطوط پر عملاً پیش رفت ہوئی ان میں سے ایک کو تو جماعت کے سابق "اصولی انقلابی" مزاج کے ساتھ ہم آہنگی اور موافقت حاصل تھی دوسرا اس سے متضاد بھی تھا اور متصادم بھی۔

اسلامی دستور کا مطالبہ اور قراردادِ مقاصد کی منظوری

جماعت کے انقلابی مزاج کے ساتھ مطابقت کی حامل لائن "مطالباتی سیاست" کی تھی جس کا مظہر جماعت کا یہ "مطالبہ" تھا کہ پاکستان کا دستورِ مملکت اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ اور کتاب و سنت کی کامل بالادستی کی بنیاد پر بنایا جائے۔ جماعت کا یہ

مطالبہ تحریکِ پاکستان کے عوامی نعرے "پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا الٰہ الّا اللہ!!" کے ساتھ بھی ہم آہنگ تھا اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی کم از کم خواہشات اور آرزوؤں کی ترجمانی بھی کرتا تھا ـــــ مزید بر آں چونکہ جماعتِ اسلامی اس وقت تک معروف معنوں میں "سیاسی جماعت" یعنی حریفِ اقتدار نہیں تھی لہٰذا دوسری سیاسی جماعتوں کے "اسلام پسند" لوگوں حتیٰ کہ خود بر سرِ اقتدار جماعت یعنی مسلم لیگ کے اہم حلقوں نے بھی اس مطالبے کی بھرپور تائید کی۔ اور بالآخر پاکستان کے پہلے اور آخری "شیخ الاسلام" علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی مساعی تو اس سلسلے میں فیصلہ کن ثابت ہوئیں اور "قراردادِ مقاصد" کی صورت میں یہ مطالبہ کم از کم اصولی اعتبار سے تسلیم کر لیا گیا۔

انقلابِ قیادت کا نعرہ اور انتخابی سیاست

اس کے برعکس دوسری لائن یعنی "انقلابِ قیادت" کے نعرے کے ساتھ "انتخابی سیاست" کے میدان میں کود جانا جماعت کے سابقہ موقف کے بالکل برعکس تھا۔ اس لئے کہ نہ ابھی کوئی ذہنی اور فکری انقلاب برپا ہوا تھا' نہ ہی معاشرے میں اخلاقی اور عملی تبدیلی معتدبہ حد تک پیدا ہوئی تھی۔ اندریں حالات جماعت کا الیکشن میں حصہ لینا ان تصورات اور نظریات کے بالکل خلاف تھا جن کا نہایت پُر زور پرچار جماعت نے مسلسل چھ سال تک کیا تھا۔ مزید بر آں اس اقدام نے جماعت کو "یکلخت" ایک "اصولی اسلامی انقلابی جماعت" کی بجائے "اسلام پسند قومی سیاسی جماعت" کی حیثیت دے دی۔ لہٰذا اس سے جماعت کی صف دوم کے رہنماؤں اور غور و فکر کی صلاحیت کے حامل ارا کین کے ذہنوں میں خلجان پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

اس خلجان کو "قراردادِ مقاصد" کی منظوری کی "فتح مبین" نے کچھ عرصے کے لئے تو دبائے رکھا لیکن اس کے بعد جب بعض صوبائی انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو بے چینی ایکدم بڑھ گئی اور یہ احساس زور پکڑ گیا کہ ہم غلط رخ پر مڑ گئے ہیں۔ اس لئے کہ جماعت کے سابق اصولی اور انقلابی مزاج کے تقاضے کچھ اور تھے اور

معاشرے کے موجود الوقت حالات و کیفیات کے پیشِ نظر انتخابی سیاست کے عملی تقاضے ان کے بالکل برعکس تھے۔ اور ظاہر ہے کہ "سکہ ہائے رائج الوقت" کے بھرپور استعمال کے بغیر انتخابات میں کامیابی قطعی طور پر ع "ایں خیال است و محال است و جنوں!" کے مترادف تھی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ وہ دن اور آج کا دن' جماعتِ اسلامی پاکستان اس خلجان میں مبتلا اور مسلسل ؎

"ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!"

کی کشمکش کا شکار ہے۔

چنانچہ ایک جانب جماعت کی "اصول پسندی" اور دوسری جانب معروضی حالات کے پیشِ نظر "واقعیت پسندی" کے تقاضوں کے مابین تصادم ہی کا ایک اہم مظہر یہ رائے تھی کہ جب تک حکومتِ پاکستان بھارت کے خلاف جنگ کا اعلان نہ کرے' کسی پاکستانی کا جہادِ کشمیر میں حصہ لینا جائز نہیں ہے' جس نے جماعت اور اس کی قیادت کو عوام کی نگاہوں میں مشکوک بنادیا۔

ابتدائی انتخابی پالیسی اور اس کے نتائج

پھر اسی "اصول پسندی" کا اہم مظہر یہ رائے بھی تھی کہ: "امیدواری حرامِ مطلق' اور پارٹی ٹکٹ لعنت ہے" لہٰذا ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے صوبائی انتخابات (جو قیامِ پاکستان کے بعد کسی بھی سطح کے پہلے انتخابات تھے) میں جماعت نے اس طور سے حصہ لینے کا فیصلہ کیا کہ پہلے ووٹر یہ عہد کریں کہ: (۱) "میں ووٹ دینے میں ذاتی فائدے اور نقصان کا یا اپنے ذاتی اور برادری کے تعلقات کا لحاظ نہ کروں گا۔ (۲) میں صرف اس شخص کو ووٹ دوں گا جو اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں خدا اور رسول کے احکام کا پابند ہو' جو اپنے لین دین میں ایمان دار اور اپنے معاملات میں کھرا ہو' جو اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو (۳) میں کسی ایسے شخص کو ووٹ نہیں دوں گا جو خود امید وار بن کر کھڑا ہو اور ووٹ

حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ اور(۴) اگر مجھے کوئی نیک آدمی ووٹ دینے کے لئے نہ ملے گا تو میں سرے سے ووٹ ہی نہیں دوں گا"۔ پھر جو لوگ یہ عہد نامہ پر کردیں ان پر مشتمل "پنچائتیں" بنائی جائیں جو اپنے علاقے میں سے کسی "صالح نمائندے" کو تلاش کریں اور اس سے "درخواست" کریں کہ وہ انتخابات میں ذاتی طور پر امیدوار کی حیثیت سے نہیں بلکہ پنچائت کے نمائندے کی حیثیت سے حصہ لے، پھر اس کے لئے کنویسنگ بھی یہ پنچائتیں کریں نہ کہ وہ خود اور ضروری اخراجات بھی پنچائتیں ہی برداشت کریں نہ کہ ان کے "نمائندے"!

ان بلند و بالا، اور اعلیٰ و ارفع اصولوں کے مطابق انتخابات میں پورے ملک کے ارکان اور کارکنوں کو جمع کر کے شدید ترین محنت و مشقت کے ساتھ حصہ لیا گیا تو امید تو یہ تھی کہ کم از کم تیس ورنہ چالیس سیٹیں مل جائیں گی، لیکن عملاً نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بھی "پنچائتی نمائندہ" کامیاب نہ ہوسکا اور جماعت چاروں شانے چت ہوئی!

پھر کچھ عرصہ بعد، اصولوں کو نظری طور پر جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے، لیکن ہاتھ کو کچھ "نرم" رکھ کر بہاولپور کے انتخابات میں حصہ لیا تو وہاں بھی ایک سیٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا اور وہ بھی اس لئے کہ وہاں کا "صالح پنچائتی نمائندہ" خود ایک بڑا زمیندار بھی تھا!

الغرض، جماعت اسلامی کے "توسیع اور اقدام" کے مرحلے کی یہ دوسری لائن یعنی انتخابی سیاست میں حصہ لینا ایک جانب جماعت کے سابق "اصولی انقلابی" مزاج اور موقف سے متصادم تھی تو دوسری جانب معاشرے کے معروضی حالات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جماعت کے کارکن چکی کے دو پاٹوں کے مابین پس رہے تھے۔ اور جہاں ان کی اکثریت صبرو ثبات کا مظاہرہ کررہی تھی وہاں۔ "متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی۔ یہ کس کافر ادا کا غمزہ خونریز ہے ساقی!" کے مصداق سیاست کے اس نئے کوچے کی کافرانہ اداؤں اور غمزہ ہائے خونریز کے ہاتھوں بہت سے اللہ والوں کی متاعِ دین دانش لٹ بھی رہی تھی، جس سے جماعت

کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے دلوں میں شدید تشویش پیدا ہوگئی!

چنانچہ یہ ہیں وہ اسباب جن کے نتیجے میں ۵۵ء میں ایک طوفان جماعتِ اسلامی کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے حلقے میں سے اٹھا' جسے نومبر ۵۵ء کے سالانہ اجتماع (منعقدہ کراچی) کے موقع پر تو جماعت کی قیادت نے "اجتماعِ ارکان" کی بجائے ایک "جائزہ کمیٹی" کے رخ پر ڈال دیا[1] لیکن پھر ایک سال بعد یعنی نومبر ۵۶ء میں یہ جائزہ کمیٹی جو رپورٹ مرتب کر کے لائی اس نے جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی اکثریت کو اس رائے کا حامل بنا دیا کہ اگر ہم بالکل غلط موڑ نہیں مڑ آئے تب بھی "عدم توازن" کا شکار ضرور ہوگئے ہیں' جسے مولانا مودودی نے اپنے خلاف عدم اعتماد کا اظہار سمجھا' لہٰذا انہوں نے جماعت کی امارت سے استعفاء دیدیا! اس کے نتیجے میں ارکانِ جماعت کے حلقے میں تو تہلکہ مچنا ہی تھا' ملک کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں بھی چہ میگوئیاں ہوئیں یہاں تک کہ جماعت کی تاریخ میں پہلی بار ایک اہم رکن ہی نہیں نمایاں عہدیدار یعنی سابق امیر جماعتِ اسلامی پنجاب و مدیر اعلیٰ روزنامہ "تسنیم" لاہور نے جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو کر پریس کانفرنس منعقد کی اور اس میں جماعت کی قیادت پر شدید الزامات عائد کئے!

دستور کا تقاضا بمقابلہ "فطری امارت"

نومبر دسمبر ۵۶ء کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس سے لے کر فروری ۵۷ء کے اجتماعِ ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ تک تین چار ماہ کے عرصے کے دوران پوری جماعت شدید بحرانی کیفیت سے دوچار رہی[2] اور اس زمانے میں جو نہایت تلخ اور

---

[1] اسی "جائزہ کمیٹی" کی خدمت میں راقم الحروف نے اپنا وہ اختلافی بیان پیش کیا تھا جو دس سال بعد ۱۹۶۶ء میں "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے طبع ہوا۔ اور اب بھی دستیاب ہے۔

[2] اس کی تفصیل کے لئے مطالعہ فرمائیں راقم کی تالیف "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب"

تیز و تند خط مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کے نام لکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی کا اعتماد مولانا مودودی کی ذات پر باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اب یہ موقع تھا کہ جو پیچ در پیچ فارمولا انہوں نے ۴۶ء میں طے کرایا تھا اس کے مطابق خود سامنے آتے اور جماعت کو متبادل قیادت فراہم کرتے لیکن انہوں نے مولانا مودودی پر آمریت کا الزام تو پورے شد و مد کے ساتھ لگایا مگر خود یہ کہہ کر پسپائی اختیار کرلی کہ "اس جماعت کے فطری امیر مولانا مودودی ہی ہیں اور جماعت صرف ان ہی کی قیادت میں چل سکتی ہے!" جس پر جب ان سے عرض کیا گیا کہ "پھر آپ نے ۴۶ء میں وہ دستوری فارمولا طے کرانے کے لئے اتنی مشقت کیوں کی تھی؟" تو اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا!

بہر حال اس کا جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا وہی نکلا، یعنی نہ صرف یہ کہ جماعت کی بعد از تقسیم پوری پالیسی، بلکہ مولانا مودودی کی "فطری قیادت و امارت" کی بھی توثیق مزید ہوگئی۔ چنانچہ اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد اختلاف کرنے والے سب لوگ رفتہ رفتہ پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے گئے۔ اور اس طرح سابق "اصولی اسلامی انقلابی موقف" کے علمبرداروں کے جماعت سے علیحدہ ہوجانے کے نتیجے میں جماعت کا اس نئے سیاسی و انتخابی لائحہ عمل پر آگے بڑھنا آسان تر ہوگیا، جس میں مزید آسانی بعد ازاں امیدواری اور پارٹی ٹکٹ دونوں کو "مشرف بہ اسلام" کر کے پیدا کر لی گئی!

مارشل لاء کا نفاذ اور بحالیٔ جمہوریت کی تحریک

لیکن ع "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!" کے مصداق ابھی نئے حوصلوں اور ولولوں، اور نئی "آزادیوں" کے ساتھ کسی انتخابی اکھاڑے میں اترنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ۵۸ء میں پاکستان کی تاریخ کا پہلا ملک گیر مارشل لاء لگ گیا۔ اس کے ضمن میں بھی جماعت نے جو رویہ اختیار کیا اس کا یہ حصہ تو درست بھی تھا اور اپنے سابق اصولی موقف کے ساتھ ہم آہنگ بھی، کہ مارشل لاء

کی مخالفت کی جائے اور اس کی کسی بھی درجہ میں تائید نہ کی جائے لیکن دوسرا حصہ غلط اور پیشِ نظر اسلامی انقلاب کے اعتبار سے لاحاصل تھا' یعنی بجائے اس کے کہ اپنی پوری اجتماعی طاقت کو دعوت' تنظیم اور تربیت پر مرکوز کر کے اپنی تنظیمی قوت کو بڑھایا جاتا تاکہ کسی وقت خالص اپنے بل بوتے پر نظامِ باطل کو چیلنج کیا جاسکتا' ساری توانائیوں کو "بحالیٔ جمہوریت" کی جدوجہد میں کھپا دیا گیا --- اور اس سلسلے میں دوسری تمام "جمہوری" جماعتوں اور تنظیموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کر لیا گیا' قطع نظر اس سے کہ وہ خالص سیکولر تھیں' یا دین و مذہب کی حامی' یا علاقائی اور علیحدگی پسند رجحانات کی حامل تھیں یا قومی وحدت اور ملکی سالمیت کی علمبردار۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب گیارہ برس کی سعی و جہد اور محنت و مشقت کے بعد سابق صدر ایوب خان کی آمریت کا بت گرا اور جمہوریت کی منزل مقصود سامنے آئی تو اس کے باوجود کہ پورے ملک خصوصاً اس کے مغربی خطے میں "شوکتِ اسلام" اپنے پورے عروج پر تھی' انتخابات کے نتیجے میں پاکستان پیپلزپارٹی کے "اسلامی سوشلزم" کے پردے میں خالص سیکولر جمہوریت وجود میں آئی ---- اور جماعت اسلامی کو پورے مغربی پاکستان میں کل ساڑھے چار سیٹیں حاصل ہوئیں (چار خالص اپنے ٹکٹ پر اور ایک یعنی مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم بحیثیت آزاد امیدوار' لیکن بالفعل جماعت کی سپورٹ سے)۔ جبکہ انتخابات سے قبل جماعت کے حلقے کے جرائد اور نوخیز صحافی کم از کم چالیس سیٹوں کی نوید جانفزا سناتے رہے تھے!

جماعت کی تنظیمی ہیئت پر تنقید اور مولانا مودودی کا ردِّ عمل

اس مرحلے پر جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں' بالخصوص اس کی نوجوان قیادت اور صحافت کے حلقے میں یہ خیال شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ جماعت کی اس ناکامی کا اصل سبب جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ اور جماعتی نظام ہے' چنانچہ جماعت کی رکنیت پر عائد حلال اور حرام کی بندشیں' فرائض و واجبات کا لزوم' اور اخلاقی و عملی

قد غنیں اس کے حلقے کی محدودیت کی اصل بنیاد ہیں' پھر جماعت میں اظہارِ اختلاف پر پابندی' اور عہدوں کے حصول اور اس کے لئے دوڑ دھوپ (کنوینگ) کو حرام مطلق اور نااہلی کا قطعی سبب قرار دینا باہمت اور حوصلہ مند لوگوں کی حوصلہ شکنی کا باعث ہیں' اور ان سب پر مستزاد یہ کہ انتخابات میں "سکہ ہائے رائج الوقت" کا بھرپور' کھلم کھلا اور آزادانہ استعمال نہ کرنا (اور کرنا بھی تو شرماتے' لجاتے' اور اپنے ضمیر کے علاوہ دوسرے کارکنوں کی تنقید و احتساب کا خوف کھاتے ہوئے کرنا) انتخابات میں ناکامی کا آخری اور فیصلہ کن سبب بن جاتے ہیں' لہٰذا ضروری ہے کہ جماعت کو "اوپن" کیا جائے اور ان فرسودہ پابندیوں اور قدغنوں کو خیرباد کہہ دیا جائے!

لیکن اس وقت تک جماعت کا بانی و مؤسس اور "فطری قائد" ابھی بقیدِ حیات تھا جس نے اس نئے رجحان کی شدت کے ساتھ مذمت کی' اور اپنے ابتدائی انقلابی تصورات کے ان "باقیات الصالحات" کا پوری قوت کے ساتھ دفاع کیا جو جماعت کی اساسی رکنیت اور اس کے تنظیمی ڈھانچے سے متعلق تھیں! لہٰذا فوری طور پر تو یہ سوچ پروان نہیں چڑھ سکی البتہ اس وقت جماعت اسلامی اپنی تاریخ کے جس تیسرے اور شدید ترین بحران سے دوچار ہے اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ۱۹۷۱ء کے بعد جماعت کے نوجوانوں میں پیدا ہونے والی اس نئی سوچ اور نئے فکر کے فہم و شعور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

(۳)

انتخابی سیاست سے مولانا مودودی کی مایوسی

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے "مایوس کن" نتائج کے بعد جماعت اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے اور جماعتی نظام کے بارے میں جو "ترمیم پسند" خیالات جماعت کے نوجوانوں کے حلقے میں پیدا ہوئے تھے مولانا مودودی مرحوم کی جانب سے ان کی مذمت اور جماعت کی رکنیت کی شرائط اور معیار اور اس کے پورے تنظیمی ڈھانچے کے زوردار اور برملا دفاع کے ساتھ ساتھ اس امر کے شواہد بھی موجود ہیں کہ مولانا

مودودی کا ذہن اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے ۴۷ء میں جو "سیاسی اور انتخابی" راستہ انہوں نے اختیار کیا تھا اس کا لاحاصل اور غیر مفید ہونا آخری درجہ میں ثابت ہو گیا ہے اور اب جماعت کو اپنا وہی "اصولی اور انقلابی" طریقِ کار دوبارہ اختیار کرلینا چاہئے جس پر وہ اپنے یومِ تاسیس سے قیامِ پاکستان تک عمل پیرا رہی تھی۔

ان دونوں راستوں میں کیا فرق و تفاوت ہے اسے مولانا مرحوم کے اپنے الفاظ میں اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ : "آپ اور دوسرے اہلِ علم اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کرکے منظور کرایا جائے؟" تو اس کے جواب میں جو باتیں انہوں نے ارشاد فرمائیں وہ ان کے ذہن اور اندازِ فکر کی پوری عکاسی کردیتی ہیں۔ چنانچہ اولاً ارشاد فرمایا: "ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنی میں اسلامی ہو نہ اخلاق اسلامی، جہاں کا سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو اور جہاں ایک مجرد سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکایک نوبت آگئی ہو، وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی سی بات پر اٹکا ہوا ہو کہ ہم ایک دستور مرتب کرکے پیش کردیں اور برسرِاقتدار لوگ اسے نافذ کردیں۔" پھر اس بچگانہ سوچ پر مزید تنقید کے بعد فرمایا: "واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔" اس کے بعد پہلے طریقے کی وضاحت جن الفاظ میں کی ان کو نقل کرنے کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ وہ وہی طریقِ کار ہے جس پر جماعت ۴۷ء سے ۷۱ء تک عمل پیرا رہی اور جس کی تصدیق اسی تحریر میں مولانا کے یہ الفاظ کررہے ہیں کہ : "ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں" ـــــــ اس کے برعکس دوسرا راستہ مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریکِ اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص

اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشو و نما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔"---- اور آخر میں فرمایا کہ اگر ہم پہلے طریقے میں ناکام ہوگئے تو "اس صورت میں ہم دوسرے طریقے پر کام شروع کردیں گے جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کررہے تھے!"
(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء--- و "رسائل و مسائل" حصہ اول طبع یا زدھم صفحات ۴۲۸ تا ۴۳۱)

ایک اہم واقعہ اور اس کے آثار

مولانا سید وصی مظہر ندوی' جو ۷۱ء میں جماعت کے عام رکن ہی نہیں اہم عہدیدار اور مرکزی شوریٰ کے رکن تھے لیکن بعد میں "خارج" کردئے گئے تھے' اور اس کے بعد سیاست کی وادیوں میں سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے سابق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں وفاقی وزارت تک پہنچ گئے تھے' راوی ہیں کہ ۷۱ء ہی میں کسی موقع پر مولانا مودودی جماعت کی مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں "بطور خاص" تشریف لائے۔ "بطور خاص" اس لئے کہ اس زمانے میں وہ نہ جماعت کے امیر تھے نہ شوریٰ کے رکن (اس لئے کہ 'امارت انہوں نے کچھ عرصہ قبل خود میاں طفیل محمد صاحب کے حوالے کردی تھی' اور شوریٰ کا اس کے بعد اس وقت تک کوئی نیا انتخاب نہیں ہوا تھا۔) اس اجلاس میں مولانا نے اپنی یہ حتمی رائے پیش کی کہ ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اس ملک میں انتخابات کے ذریعے نظامِ اسلامی کا قیام ناممکن ہے۔ لہٰذا ہمیں متبادل راستہ اختیار کرنے پر غور کرنا چاہئے۔ اس پر جب میاں طفیل محمد صاحب سمیت شوریٰ کے بہت سے ارکان بالخصوص بعض نوجوانوں نے "انتخابی طریقِ کار" کی مدافعت کی اور اس کے حق میں دلائل دینے شروع کئے تو کسی قدر گفتگو اور ردّو قدح کے بعد مولانا نے زچ ہو کر اور قدرے بھنّا کر فرمایا کہ: "یہ ساری دلیلیں میں نے ہی آپ لوگوں کو سکھائی تھیں' تاہم میں اب جس نتیجے تک پہنچ

گیا ہوں میں نے اسے آپ لوگوں تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ آگے آپ لوگ جانیں اور آپ کا کام!" اور اسی آزردہ اور دل گرفتہ کیفیت کے ساتھ مولانا وہاں سے رخصت ہوگئے۔ یہ روایت بذاتِ خود بھی ایک "ثقہ" راوی کی ہے۔ مزید برآں اس کی تائید میں "قرائن کی شہادت" کے طور پر یہ حقیقت بہت سے واقفانِ حال کے علم میں ہے کہ اس کے بعد سے مولانا مرحوم کے انتقال تک پورے آٹھ برس مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے مرکز کے مابین زمینی اور مکانی فاصلے کے ساتھ ساتھ ایک مسلسل "سرد جنگ" کی سی کیفیت بھی جاری رہی جس کے دوران بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ جماعت کے کسی رہنما کے بیان پر مولانا نے نہایت غضب آلود تردیدی بیان اخبارات کو بھجوایا' جو بعض اخبارات میں تو شائع بھی ہوگیا لیکن اکثر اخبارات میں اشاعت کو جماعت کے مرکز نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے رکوالیا---- اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی عمر کے اس آخری دور کے ذہنی اور نفسیاتی کرب ہی کا مظہر اس وقت دنیا کے سامنے بالفعل اس صورت میں موجود ہے کہ مولانا کی اہلیہ صاحبہ اور بیٹوں اور بیٹیوں سمیت پوری اولاد جماعتِ اسلامی سے بالعموم اور اس کی قیادت سے بالخصوص شدید بدظن اور نالاں ہے!

رہا یہ سوال کہ مولانا نے یہ بات علی الاعلان کیوں نہ کہی' اور جماعت کے عام ارکان اور پاکستان کے عوام کے سامنے اپنی رائے کا ببانگِ دہل اعلان کیوں نہ کیا؟ تو اس کا جو جواب بادنیٰ تأمل سامنے آجاتا ہے وہ یہ ہے کہ سرسٹھ اڑسٹھ برس کی عمر اور اپنی علالت اور گوناگوں عوارض کے پیشِ نظر مولانا کے لئے یہ ناممکن تھا کہ دوبارہ جماعت کی امارت سنبھال کر خود ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھتے اور اس بھاری بھرکم اور تیز رفتار گاڑی کا رخ ایک سو اسی درجے کے زاویئے پر موڑنے کی کوشش کرتے---- اور محض تخریب ظاہر ہے کہ کسی بھی معقول اور شریف انسان کو پسند نہیں آسکتی! بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت اسی "سیاسی اور انتخابی" راستے پر چلتی رہی جس پر گذشتہ ربع صدی سے چلتی آرہی تھی۔ البتہ مولانا مودودی کی موجودگی کے باعث

اس کے تنظیمی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکی۔

بحالیٔ جمہوریت کی مساعی کے نتائج اور اس سے "توبہ"

اس اثناء میں بحالیٔ جمہوریت کی گیارہ سالہ مساعی کے نتیجے میں فیلڈ مارشل ایوب خان کا قصرِ اقتدار زمیں بوس ہوا تو اس کے ملبے تلے سے جو کچھ برآمد ہوا وہ اولاً پاکستان کے دولخت ہونے کا عظیم اور اندوہناک سانحہ تھا' اور ثانیاً بچے کھچے پاکستان میں پیپلز پارٹی کی خالص سیکولر حکومت تھی۔ پھر اس کے خلاف عوامی احتجاجی تحریک الموسوم بہ "تحریک نظامِ مصطفیٰ" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں دوسری جماعتوں کے ساتھ جماعتِ اسلامی نے بھی بھرپور حصہ لیا تو اس کے نتیجے میں دوبارہ مارشل لاء نافذ ہوگیا۔ اور اس نئے مارشل لاء نے اسلام کے نعرے کو ایوانِ اقتدار اور قصرِ صدارت میں "سجا" کر جملہ دینی اور مذہبی جماعتوں کو بے دست و پا کردیا۔ نتیجۃً جماعتِ اسلامی سمیت بعض مذہبی جماعتوں کو پہلے تو مصلحت اس میں نظر آئی کہ مارشل لاء کی حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کے ذریعے "اوپر سے انقلاب" لانے کے سنہرے موقع سے فائدہ اٹھایا جائے' اور جب معلوم ہوا کہ ہاتھی کے کھانے اور دکھانے کے دانت مختلف ہیں لہٰذا اقتدار کے "کوچۂ رقیب" سے "بہت بے آبرو ہو کر" نکلنا پڑا' تب بھی عافیت اسی میں نظر آئی کہ اندرونِ خانہ تو مصالحت اور مفاہمت کی روش یا عرفِ عام میں "ماموں بھانجے کا رشتہ" برقرار رکھا جائے البتہ وقتاً فوقتاً گرم سرد بیانات کے ذریعے جماعت کا سیاسی وجود اور تشخص کسی نہ کسی درجہ میں قائم رکھا جائے۔ لیکن "بحالیٔ جمہوریت" کا تلخ تجربہ دوبارہ ہرگز نہ دہرایا جائے' خواہ "اڑوس پڑوس" کچھ بھی کہیں اور خود جماعت کے کارکن بھی کتنے ہی بددل کیوں نہ ہوں۔

جماعتِ اسلامی کی قیادت نے "بحالیٔ جمہوریت" سے اپنی اس "توبہ" پر لگ بھگ دس برس تک جس استقامت کا ثبوت دیا وہ اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ داد کیوں نہ ہو' واقعہ یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے سیاسی اور انتخابی (یعنی جمہوری) لائحہ عمل پر قائم رہتے ہوئے عملاً خالص غیر جمہوری اور غیر سیاسی روش اختیار کرنے سے جماعت

میں جو "تعطل" پیدا ہوا اور لگ بھگ بیس برس تک جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگانے والے کارکنوں کی نفسیات میں فوجی حکومت کے ساتھ براہِ راست یا بالواسطہ تعاون کے باعث جو شکست و ریخت پیدا ہوئی اس کے نتیجے میں جماعت پر مردنی طاری ہوتی جارہی تھی کہ اچانک ۔ "خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں ۔ توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!" کے سے انداز میں قاضی حسین احمد صاحب جماعت کے منظر پر نمودار ہوئے اور پہلے قیم یا سیکرٹری جنرل اور پھر امیرِ جماعت کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

جماعت کے نئے امیر قاضی حسین احمد

قاضی صاحب جوان بھی تھے اور "مردِ کہستانی" ہونے کے ناتے محنتی اور جفاکش بھی، باہمت بھی تھے اور حوصلہ مند بھی، اور بذاتِ خود فعال اور متحرک ہونے پر مستزاد افغان جہاد سے قریبی رابطے کی بنا پر "جنگجو" بھی تھے اور بہادر بھی، پھر چونکہ انہیں امارت کا منصب مولانا مودودی کے "معتمد علیہ اور وفادار رفیقِ کار" ہونے کی بنا پر نہیں ملا تھا بلکہ وہ اس عہدے پر اپنے ذاتی استحقاق کی بنیاد پر فائز ہوئے تھے، لہٰذا وہ پر اعتماد بھی تھے اور کسی قدر "تحکمانہ" انداز کے حامل بھی، ——— گویا وہ ان جملہ صفات کے اعتبار سے "ہمہ صفت موصوف" تھے جو کسی عوامی تحریک کو طوفانی انداز میں چلانے کے لئے مطلوب ہوتی ہیں۔ مزید برآں یہ بات بھی ۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی!

کے مصداق ان کی کسی عوامی تحریک کو طوفانی انداز میں چلانے کی صلاحیت کے اعتبار سے موزوں تر بھی ہے اور مناسب تر بھی کہ ان میں جوش زیادہ ہے اور ہوش کم اور تہوّر زیادہ ہے اور تدبّر کم!!

جماعت کی مایوسی اور "پاسبان" کا قیام

بہر حال قصہ مختصر یہ کہ انہوں نے ایک جانب تو کچھ جماعت کے "سیاسی و انتخابی لائحہ عمل" کے تسلسل کے طور پر، کچھ اپنی ذاتی صوابدید کی بنیاد پر، اور کچھ "عالمِ بالا" کے اشاروں پر آئی جے آئی میں شمولیت اختیار کی اور اس کی انتخابات میں کامیابی کے بعد "نیمے دروں اور نیمے بروں" کی روش کے ذریعے اقتدار سے بالواسطہ استفادے کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے تقاضے کے طور پر حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، لیکن جب معلوم ہوا کہ آئی جے آئی کے ذریعے "لبرل اسلام" اور "سیکولر نظام" سے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں تو اس سے علیحدگی اختیار کرلی--- اور دوسری جانب پہلے تو بھرپور کوشش کی کہ جماعتِ اسلامی کی نیم مردہ رگوں میں حرکت و عمل کا تازہ خون دوڑادیں، لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ یہاں تو اب ۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے!

کے مصداق ایک بڑے "نام" کے سوا اور کچھ باقی نہیں ہے جو ایک احیائی اسلامی تحریک کے اعتبار سے تو اندرونِ ملک سے زیادہ بیرونِ ملک پہچانا جاتا ہے، البتہ اندرونِ ملک بھی رفاہی کاموں یا کسی بیرونِ ملک "جہاد" کے نام پر پیسے جمع کرنے کے کام آسکتا ہے، تو انہوں نے اسے اسی درجہ میں برقرار رکھتے ہوئے اپنے پیشِ نظر عوامی تحریک کے لئے ایک متبادل اور متوازی تنظیم قائم کردی اور اپنی ان صلاحیتوں کے بل پر جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے اسے دیکھتے ہی دیکھتے ایک زندہ اور متحرک قوت بنا کر کھڑا کردیا۔ چنانچہ جماعت کے موجودہ بحران کا اصل سبب یہی "پاسبان تنظیم" ہے جس کے اصول و مبادی، طریقِ کار اور طریقِ تنظیم، اور طور طریقوں اور رنگ ڈھنگ کو جماعت کے کم از کم ان "بزرگوں" کا ذہن کسی طرح قبول نہیں کرسکتا جو ۱۹۴۱ء میں "ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت" کے احساس کے تحت جماعتِ

اسلامی میں شامل ہوئے تھے' اس لئے کہ اگرچہ یہ تنظیم زندہ بھی ہے اور متحرک بھی' فعال بھی ہے اور پرجوش بھی' اور قوی بھی ہے اور توانا بھی' لیکن مولانا مودودی مرحوم کے تنظیمی تصورات و معیارات کی کامل نفی بھی ہے' اور "ایک صالح جماعت" کا مکمل اینٹی تھیسس بھی!

اس تنظیم کے بارے میں جماعت اسلامی کے "یکے از بزرگان" ہی نہیں اس کے السابقون الاولون کے باقیات الصالحات میں سے فکری اور نظریاتی اعتبار سے اہم ترین شخصیت یعنی جناب نعیم صدیقی تو یہ تک کہہ رہے ہیں کہ "قادیانی ہو یا اسماعیلی' موحد یا ملحد' امریکی ایجنٹ ہو یا "را" کا کارندہ' سب کے لئے اس کے دروازے کھلے ہیں!" (ہفت روزہ تکبیر بابت ۲۴ر ستمبر ۹۲ء) اور بعض قدرے غیر محتاط ارکانِ جماعت اسے "غنڈوں کی تنظیم" سے بھی تعبیر کررہے ہیں' لیکن ہمارے نزدیک اس کی محتاط ترین تعبیر بھی حافظؒ کے اس شعر کی صورت میں کی جاسکتی ہے کہ

صنما رہِ قلندر سزور بہ من نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسمِ پارسائی!

یعنی "اے اللہ! مجھے رہ و رسم پارسائی یعنی حلال و حرام کے حدود و قیود کی پابندی اور فرائض و واجبات کی ادائیگی کا راستہ تو نہایت دور دراز اور کٹھن بلکہ ناممکن نظر آتا ہے' لہٰذا مجھے تو کوئی دوسرا راستہ یعنی قلندری کی راہ دکھا جو میرے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے!" گویا یہ ایسے پرجوش نوجوانوں کی تنظیم ہے جو وقت آنے پر جانیں تو قربان کردیں گے لیکن دین و شریعت کی پابندی یعنی تقویٰ اور تدین کی روش اور جماعتی نظم کی بندشیں اور قواعد و ضوابط کی قدغنیں برداشت نہیں کرسکتے! (اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی ڈھیلی ڈھالی تنظیم میں نعیم صدیقی صاحب کے قول کے مطابق ہر قسم کے لوگوں کے در آنے کا امکان موجود رہتا ہے۔)

فیصلہ کن مرحلہ

بہرحال "پاسبان تنظیم" کے قیام کے بعد جماعتِ اسلامی اس آخری اور فیصلہ

کن دوراہے پر پہنچ گئی ہے کہ "یا چناں کن یا چنیں" کے مصداق یا تو "قومی و سیاسی" لائحہ عمل کے عملی تقاضوں کے مطابق اپنی قدیم "اصولی اور انقلابی" ہیئت تنظیمی کے دقیانوسی لبادے کو بالکل اتار پھینکے اور دین و شریعت اور اخلاق و کردار کے تقاضوں کو "مقاصد ہی ذرائع کو جواز فراہم کرتے ہیں" کے اصول کی تلوار سے ذبح کر کے عوامی سیاست کے میدان میں "کر گذر جو آئے بن!" کی روش اختیار کرلے ـــــ اس لئے کہ پاسبان تنظیم کی آکاس بیل کے فروغ کا لازمی منطقی نتیجہ مادرِ شجر یعنی جماعتِ اسلامی کے خاتمے ہی کی صورت اختیار کرے گا ـــــ یا اگر قبل از قیامِ پاکستان قائم شدہ تنظیمی ڈھانچہ اور "رہ و رسم پارسائی" کی جو تھوڑی بہت پونجی باقی رہ گئی ہے اسے برقرار رکھنا ہے تو دوبارہ قبل از قیامِ پاکستان ہی کا لائحہ عمل اور طریقِ کار بھی اختیار کرے!

چند مخلصانہ مشورے

تاہم اس مرحلے پر فرمانِ نبویؐ "الدِّینُ النَّصِیحَۃُ" پر عمل کرتے ہوئے اور جماعتِ اسلامی پاکستان کی نہ سہی' تجدید و احیائے دین کی عالمی تحریک کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت بعض گذارشات ایک جانب نہ صرف قاضی حسین احمد اور ان کی اسلامی جمعیت طلبہ سے در آمد شدہ سرپرستوں اور حامیوں کی پوری ٹیم بلکہ پاسبان کے کارکنوں کی خدمت میں' اور دوسری جانب میاں طفیل محمد اور جناب نعیم صدیقی اور ان کے ہم خیال "بزرگوں" کی خدمت میں پیش ہیں' جن پر اگر وہ سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ غور کرلیں تو شاید دین و ملت اور ملک و وطن دونوں کی بہتری کی صورت پیدا ہوسکے' ـــــ غور و خوض کے بعد ظاہر ہے کہ رد و قبول کا آخری اختیار تو بہرحال ان ہی کے پاس ہے!

۱۔ جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ امر مسلم ہے کہ ذاتی اعتبار سے قاضی حسین احمد صاحب میں ایک عوامی تحریک برپا کرنے کی صلاحیت موجود ہے' پھر انہوں نے پاکستان کے عوام کی نفسیات کے مطابق عوامی مقبولیت کے وہ طور طریقے بھی

اختیار کر لئے ہیں جو کبھی بھٹو صاحب نے استعمال کئے تھے یعنی "بھارت کے ساتھ ہزار سالہ جنگ" کے انداز میں "لال قلعہ دہلی پر پاکستانی پرچم لہرانے کا عزم" اور امریکہ کی مخالفت اور اس کے خلاف "بڑکیں" مارنا' وغیرہ---- مزید برآں وہ اب پاکستان میں جہادِ افغانستان اور جہادِ کشمیر دونوں کے بھی "واحد وارث" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ملک کے اقتصادی حالات اور عوام کی بڑھتی ہوئی مایوسیاں اور محرومیاں بھی کسی عوامی تحریک کے لئے ساز گار فضا فراہم کر رہی ہیں ---- لہٰذا اس کا حقیقی اور واقعی امکان موجود ہے کہ قاضی صاحب اور پاسبان تنظیم ایک عوامی تحریک برپا کردیں۔

۲۔ لیکن اس عوامی تحریک کے نتیجے میں اور سب کچھ برآمد ہو سکتا ہے وہ "صالح انقلاب" ہرگز برپا نہیں ہو سکتا جو اب سے چودہ سو سال قبل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا تھا۔ چنانچہ اس عوامی تحریک کے نتیجے میں جہاں یہ منفی نتائج بھی نکل سکتے ہیں کہ ملک میں خالص سیکولر اور شدید جابرانہ قسم کا مارشل لاء لگ جائے' یا ملک خدانخواستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے' وہاں یہ "مثبت" نتائج بھی نکل سکتے ہیں کہ بھٹو صاحب کی حکومت کی طرح قاضی صاحب کی حکومت قائم ہو جائے' اور ایسا کسی ایجی ٹیشن کے نتیجے میں بھی ہو سکتا ہے اور ملک کے عام انتخابات میں طوفانی انداز کی کامیابی کے ذریعے بھی ---- لیکن ہوگی یہ حکومت بھی لامحالہ بھٹو صاحب کی حکومت سے بھی زیادہ عارضی اور ناپائیدار' اس لئے کہ مولانا مودودی نے اب سے پچاس سال قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں جو خیالات "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کے ضمن میں پیش کئے تھے وہ آج بھی صد فی صد درست ہیں۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں مولانا مودودی ہی کے محولہ بالا الفاظ میں:

"نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو' نہ اخلاق اسلامی ہوں' جہاں کا سیاسی و معاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو" وہاں اول تو اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی اور اگر بالفرض کسی "مجرد" عوامی تحریک کے ذریعے

اتفاقاً اسلام پسند لوگوں کی حکومت قائم ہو بھی جائے تو نہ وہ اسلام کو بالفعل قائم کرسکے گی نہ ہی خود قائم رہ سکے گی!---- اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک انقلابی دعوت اور جدوجہد کے ذریعے اسلامی نظام کے قیام کا عظیم کام پوری انسانی تاریخ میں آج سے قبل بھی صرف ایک ہی بار ہوا ہے، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے اور آئندہ بھی صرف ایک ہی بار ہوگا۔ لیکن جب بھی ہوگا اسی نہج اور طریقِ کار سے ہوگا جو منہجِ نبویؐ پر مبنی اور اس سے مستنبط ہو! (اللہ ہمیں اس کے صحیح فہم اور اتباع کی توفیق عطا فرمائے!)۔

۳۔ اس ضمن میں یہ بات تو صد فی صد درست ہے کہ انقلابی جدوجہد کا آخری مرحلہ "تصادم" ہی کا ہوتا ہے اور اس مرحلے پر اصل ضرورت سرفروشوں اور فدائیوں ہی کی ہوتی ہے، ---- پھر یہ بھی درست ہے کہ اس مرحلے پر سلجھے اور منجھے ہوئے یعنی "تربیت یافتہ" لوگوں کے ساتھ ساتھ نوواردوں کی بھی بڑی تعداد شامل ہوجایا کرتی ہے لیکن انقلاب کی کامیابی اور پائداری کے لئے لازم ہے کہ اس جدوجہد میں اصل ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اور فیصلہ کن غلبہ مقدم الذکر قسم کے لوگوں کو حاصل رہے، بصورتِ دیگر اس کا بھی خطرہ رہتا ہے کہ انقلاب راستے ہی سے "ہائی جیک" کرلیا جائے، ورنہ یہ اندیشہ تو بالکل یقینی ہے کہ ع "مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!" کے مصداق کامیاب ہوتے ہی فوراً ناکام بنادیا جائے!

۴۔ اس کے باوجود اگر قاضی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک مثبت توقعات کا پلڑا ان منفی خدشات کے مقابلے میں بھاری ہو اور وہ ع "آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!" کے مطابق فوری عوامی تحریک کا یہ طریقہ آزمانا ہی چاہیں تو دیانت اور مصلحت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ اس کے لئے جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم کو چھوڑ کر خالص پاسبان کا پلیٹ فارم اختیار کریں۔ یہ دیانت کا تقاضا اس لئے ہے کہ یہ جماعت کے تاسیسی نظریات اور اس کے بانی اور مؤسس کے تنظیمی

تصورات سے صریح انحراف ہے--- اور مصلحت کا تقاضا اس لئے ہے کہ اگرچہ جماعت فنڈز حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ اور اس اعتبار سے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے نام کے ساتھ مولانا مودودی کا نام ہمیشہ کے لئے چپکا رہے گا اور ان کے دینی اعتقادات اور سیاسی نظریات تاریخ کے صفحات سے کبھی مٹائے نہیں جاسکیں گے' اور آپ اور آپ کے ساتھی خواہ کتنے ہی بزرگانِ دین کے مزارات پر چادریں چڑھالیں' تاریخ کی اس شہادت کو زائل نہیں کرسکیں گے کہ لاہور شہر میں ۳۳ برس قیام کے باوجود مولانا نے ایک بار بھی سید عثمان بن علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری نہیں دی ---- اسی طرح آپ کی قائد اعظم کے مزار پر حاضری کا ایک سجدۂ سہو اس کی تلافی نہیں کر سکتا کہ مولانا نے پوری زندگی نہ مزار قائد پر حاضری دی' نہ مزارِ اقبال پر!---- اور یہ کہ وہ تحریک پاکستان کے بھی مخالف تھے' اور ۱۹۴۸ء کے جہادِ کشمیر میں بھی پاکستانی شہریوں کی شرکت و شمولیت کو درست نہیں سمجھتے تھے!

۵۔ دوسری طرف جماعت کے "بزرگوں" اور ان کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ وہ اس تلخ حقیقت کے اعتراف سے گریز کی روش کو ترک کردیں کہ جو کچھ آج قاضی صاحب کررہے ہیں' اور جن چیزوں سے آپ آج سخت توحّش اور بیزاری محسوس کررہے ہیں وہ سب اس غلطی کے برگ و بار ہیں جو ۱۹۴۸-۴۷ء میں پوری نیک نیتی لیکن "عجلت پسندی" کے تحت ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ یہ سب اس "قومی سیاسی اور جمہوری لائحہ عمل" کے منطقی لوازم اور ناگزیر نتائج ہیں جو قیام پاکستان کے بعد اپنے سابق "اصولی اسلامی انقلابی لائحہ عمل" کو ترک کرکے اختیار کیا گیا تھا۔ اور اس عظیم تحریک کے اثرات و ثمرات کو آخری تباہی سے بچانا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ صاف اعلان کیا جائے کہ اب (مولانا مودودی کے اپنے الفاظ میں) "ہم پھر (اسی) دوسرے طریقے پر کام شروع کردیں گے' جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کررہے تھے!" اس لئے کہ ابھی ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوان

اور ادھیڑ عمر کے لوگ اس ملک میں موجود ہیں جن کے ذہن و فکر میں جماعتِ اسلامی کے تاسیسی نظریات کی روشنی' اور قلب و جگر میں انقلابی جذبے کی گرمی موجود ہے' لیکن انہیں فکر اور عمل کے تضاد نے معطل ہی نہیں مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اور وہ اس صاف اور صریح اعتراف کے بعد' ان شاء اللہ العزیز ---- ع "ہوتا ہے جادۂ پیما پھر کارواں ہمارا!" کے سے انداز میں سرگرم سفر ہو جائیں گے' بصورت دیگر آپ بھی پت جھڑ کے پتوں کے مانند جھڑ کر رہ جائیں گے' اور جماعت کا شیرازہ بھی منتشر ہو جائے گا ---- ہاں "پاسبان تنظیم" کم از کم فوری طور پر تو چلے گی' رہا یہ معاملہ کہ اس سے کیا خیر یا شر وجود میں آئے گا تو یہ صرف اللہ ہی کے علم میں ہے!

آخر میں جماعت اسلامی کے تمام ارکان اور کارکنوں اور جملہ خیر خواہوں اور مخلصوں سے بھی درخواست ہے کہ ع اپنی خودی پہچان او غافل افغان!" کے مصداق جس تحریک کے ساتھ وہ کسی بھی درجہ میں وابستہ ہیں یا رہے ہیں اس کی عظمت کو بھی سمجھیں اور موجودہ فیصلہ کن مرحلے کی اہمیت کو بھی پہچانیں۔ اور پھر پورے معاملے پر از سر نو غور کرتے ہوئے کسی بھی سابق عصبیت یا عقیدت کو راہ میں حائل نہ ہونے دیں ---- اس کے نتیجے میں کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جماعت کے موجودہ بحران کے ظاہری "شر" کے بطن سے نہ صرف اپنے دین اور اس کے احیاء و تجدید اور غلبہ و اقامت' بلکہ اس سلطنت خداداد پاکستان اور اس سے بھی آگے بڑھ کر پورے عالمِ اسلام اور بالآخر پوری نوعِ انسانی کے لئے کوئی عظیم "خیر" برآمد کردے۔ **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز!**

عَنِ الحَارِثِ الاَشعَرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ ۵

بِالجَمَاعَةِ ۱ وَالسَّمعِ ۲ وَالطَّاعَةِ ۳ وَالهِجرَةِ ۴ وَالجِهَادِ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ ۵"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد وجامع ترمذی)

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

● ضخامت - ۲۳۶ صفحات ● سائز بڑا ● طباعت آفسٹ ● مجلد مع گرد پوش

● قیمت - ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ

کرشن نگر، لاہور

کتاب "تحریک جماعتِ اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ" کے اشتہار پر مشتمل بلاک کا عکس جو ۷۰ء کے عشرے میں ماہنامہ میثاق کے ٹائٹل کے آخری صفحے پر شائع ہوتا رہا۔

پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور دینی جماعتیں

پاکستان کی قومی سیاست میں

مذہبی جماعتوں کا کردار

(بسلسلہ تفکر و تذکر ــــ بشکریہ نوائے وقت)

پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں اور اس کے میزانیہ نفع و نقصان کے موضوع پر گفتگو سے قبل تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ان میں سے دو باتیں تو سادہ بھی ہیں اور مختصر بھی ' یعنی ایک یہ کہ یہاں سیاست کا وسیع تر مفہوم پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف انتخابی سیاست ہے جس میں حصہ لینے والی جماعتیں الیکشن لڑ کر اس کے نتیجے میں حزبِ اقتدار یا حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ اس گفتگو میں مذہبی جماعتوں سے مراد بھی صرف وہ مذہبی جماعتیں ہیں جو الیکشن میں براہِ راست حصہ لیتی ہیں ' دوسری مذہبی جماعتیں ' خواہ ان کی سرگرمیاں کتنی ہی وسیع ہوں (جیسے مثلاً تبلیغی جماعت) اور وہ انتخابات پر بھی بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہوں ' اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔

تیسری وضاحت جو کسی قدر تلخ بھی ہے اور تفصیل طلب بھی ' یہ ہے کہ حقیقتِ واقعی کے اعتبار سے قومی سیاست کا وجود پاکستان کے ابتدائی چند سالوں کے بعد ہی ناپید ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کی سیاست کو ملکی سیاست تو قرار دیا جاسکتا ہے ' قومی نہیں! چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز کے سامنے جیسے ہی یہ موضوع آیا ' اور

اس نے اس پر اظہارِ خیال کے لئے غور شروع کیا' تو فوری طور پر ذہن اس روایتی لطیفے کی جانب منتقل ہوگیا کہ جب ایک ضعفِ بصارت کے مریض کو ڈاکٹر نے کرسی پر بٹھا کر سامنے کی دیوار پر آویزاں چارٹ پر درج عبارت پڑھنے کو کہا تو مریض نے پوچھا: "کونسا چارٹ؟" اور اس پر جب ڈاکٹر نے کہا: "وہ جو سامنے کی دیوار پر لگا ہوا ہے!" تو مریض نے سوال کیا: "وہ دیوار کہاں ہے؟" --- حقیقت یہ ہے کہ بعینہٖ یہی معاملہ پاکستان کی قومی سیاست کا ہے کہ ع "ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!"

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے کے دوران مسلمانانِ ہند کی عظیم قومی تحریک کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور پورے برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا اتنا ظاہر و باہر اور اس قدر حتمی اور قطعی تھا کہ وقت کی برطانوی حکومت' انڈین نیشنل کانگرس ایسی عظیم سیاسی قوت اور جمعیت علمائے ہند ایسی با اثر مذہبی جماعت کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا--- لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر میں بھی ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس عظیم قومی جدوجہد کے دوران بھی مسلم لیگ اصلاً صرف ایک "تحریک" کی حیثیت رکھتی تھی' اور اسے ایسی منظم جماعت کی حیثیت حاصل نہیں تھی جس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی صفیں اور درجے (Cadres) مرتب اور معین ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی پاکستان قائم ہوا مسلم لیگ پر اضمحلال طاری ہوگیا۔ اس ابتدائی اضمحلال کی تلافی کے لئے یہ مصنوعی صورت اختیار کی گئی کہ مسلم لیگ کی صدارت اور ملک کی وزارتِ عظمیٰ کو ایک ہی شخص میں جمع کر کے قومی جماعت کو حکومت کا سہارا دیا جائے۔ لیکن ع "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" یعنی اس کے بھی برعکس نتائج برآمد ہوئے اور اس طرح مسلم لیگ کی عوامی جڑیں کمزور پڑتی چلی گئیں' یہاں تک کہ جلد ہی وہ صرف سرکار دربار کی زیبائش و آرائش کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔

ادھر مسلمہ قومی قیادت کے منظرِ عام سے ہٹنے اور قومی جماعت کے کمزور پڑنے

کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کی ملکی سیاست صرف وڈیروں ' جاگیرداروں ' نوابوں اور قبائلی سرداروں کے ذاتی مفادات کا کھیل بن کر رہ گئی اور اس سے میدانِ سیاست میں جو دھما چوکڑی مچی' اسے جواز بنا کر ۱۹۵۸ء میں پاکستان کی بری افواج کے کمانڈر انچیف نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ دن اور آج کا دن ' پاکستان میں اقتدار کے دو مستقل ستونوں کی حیثیت فوجی اور سول بیوروکریسی کو حاصل ہے ۔ رہے نام نہاد سیاستدان جن کی غالب اکثریت وڈیروں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہے تو وہ اس اقلیمِ سیاست کے دوسرے درجہ کے شہری ہیں جو لیبل بدل بدل کر مختلف سیاسی جماعتوں کی صورت اختیار کرتے رہتے ہیں اور فلمی دنیا کے ایکسٹرا اداکاروں کے مانند منتظر رہتے ہیں کہ ایوان اقتدار کے اصل قابضین میں سے کسی کی نگاہِ کرم کب اور کس پر پڑتی ہے جو کچھ دیر کے لئے "جسے پی چاہیں ' وہ ساگن!" کے مطابق حریم اقتدار میں داخل ہو سکے۔

گویا اس تجزیئے کے مطابق تو پاکستانی سیاست میں نام نہاد قومی سیاسی جماعتوں کا کردار بھی ثانوی ہے ۔ تو "تابہ دیگران چہ رسد؟" اور ع:"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا!" کے مصداق تیسرے نمبر پر شمار ہونے کے قابل علاقائی اور لسانی تنظیموں ' اور پھر ان کے بھی بعد چوتھے نمبر پر آنے والی مذہبی جماعتوں کے مثبت اور مستقل سیاسی رول کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے ۔ چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کے دوران صرف ایک مذہبی جماعت کے قائد نہایت مختصر مدت کے لئے پاکستان کے سب سے چھوٹے صوبے کے وزیراعلیٰ رہے اور وہ بھی ان لوگوں کے سہارے جو علماءِ دین کے لئے اعلانیہ طور پر نہایت رکیک اور توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں ۔ اور ایک دوسری جماعت کو پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں قابل لحاظ عرصے کے لئے اقتدار حاصل رہا لیکن صرف بلدیات کی حد تک!

البتہ ایک دوسرے اعتبار سے مذہبی جماعتیں پاکستان کی سیاست میں نہایت —

نمایاں اور مؤثر بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتی رہی ہیں' اگرچہ اس کے باوجود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ رول مثبت اور مفید رہا یا منفی اور مضر!--- ہماری مراد مختلف مواقع پر اٹھنے والی احتجاجی تحریکوں سے ہے جن کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً ایوانِ حکومت میں زلزلے آتے رہے اور پاکستان میں اقتدار کی مستقل مثلث زاویے بدلتی رہی۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوب خاں کے خلاف برپا ہونے والی ایجی ٹیشن میں بھی سب سے مؤثر کردار مذہبی جماعتوں کا تھا۔ بعد ازاں بھٹو صاحب کے اقتدار کے خاتمے کا سہرا بھی اصلاً مذہبی جماعتوں ہی کے سر تھا' اور اسی طرح حال ہی میں ان کی بیٹی کی حکومت کے خاتمے اور پھر الیکشن میں شکست کا کریڈٹ بھی سب سے بڑھ کر مذہبی جماعتوں ہی کو جاتا ہے ---- اور اس کا سبب بھی بالکل واضح ہے کہ عوام کو قربانی پر آمادہ کرنے والا سب سے مؤثر جذبہ مذہبی ہی ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر لوگ جانیں دے دینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں' تو ظاہر ہے کہ ۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے!

کے مصداق احتجاجی مہموں اور مظاہراتی سیاست کے لئے ایسے لوگوں سے بڑھ کر کون موزوں ہو سکتا ہے!

تاہم جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے اس رول کے مثبت یا منفی ہونے کا فیصلہ کرنا یا اس کا میزانیہ نفع و نقصان مرتب کرنا آسان کام نہیں ہے ۔ اس لئے کہ جہاں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ان احتجاجی تحریکوں کے نتیجے میں ایسی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا جو مختلف طبقات کو مختلف وجوہات کی بنا پر ناپسند تھیں' وہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس سے نہ اسلام کو کوئی حقیقی اور واقعی فائدہ پہنچا' نہ مذہبی جماعتوں ہی کو کچھ حاصل ہوا۔ بلکہ اینٹی ایوب ایجی ٹیشن کی کمائی بھٹو صاحب نے کھائی' اور اینٹی بھٹو ایجی ٹیشن کا فائدہ جنرل ضیاء الحق نے اٹھایا۔ گویا ع " مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی!" اس پر مستزاد یہ کہ ان تحریکوں کے نتیجے میں

پاکستان میں سیاسی عمل کی گاڑی بار بار پٹڑی سے اترتی رہی' جس کے باعث عوام کا سیاسی شعور بھی ناپختہ اور نابالغ (Retarded) رہا اور سیاسی ادارے بھی مسلسل شکست و ریخت کا شکار ہوتے رہے!

پاکستان میں قومی سیاست کے ضعف یا فقدان کے اسباب کا ذرا گہرا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں یہ عقدۂ لاینحل (Dilemma) بھی کار فرما نظر آتا ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک مسلم قومیت کی بنیاد پر چلی' اور اس کے دوران عوامی سطح پر سب سے زیادہ زور دار نعرہ اسلام کا لگایا گیا--- لیکن جب پاکستان قائم ہو گیا تو ع "جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!" کے مصداق جو واقعی صورتِ حال اور ٹھوس حقائق سامنے آئے وہ یہ تھے کہ اس میں آباد لوگوں کی غالب اکثریت میں اسلام کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تو تھی لیکن سیرت و کردار اور اعمال و اخلاق کا حال ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

کا مصداقِ اتم تھا یا اس سے بھی بڑھ کر ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

اور ؎

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

کی تصویرِ کامل! ___ بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک صورتِ حال یہ تھی کہ عوام تو پھر بھی کم از کم عقیدے کی حد تک اللہ اور رسول' قرآن اور حدیث' اور جنت اور دوزخ کے قائل تھے لیکن تعلیم یافتہ طبقات کا معتدبہ حصہ' جو قومی معاملات میں

فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!"

کا منہ بولتا ثبوت اور ع "میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو!" کی مجسم تصویر تھا۔۔۔۔ اب ظاہر ہے کہ "جذبات" کے بل پر تو "تحریکیں" چلا کرتی ہیں ' سیاست میں تو اس کے بالکل برعکس ٹھیٹھ حقائق اور ٹھوس واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو وہ ایک جانب ان ہی ٹھوس حقائق واقعی اور دوسری جانب مذہبی جذبات اور امنگوں کی رسہ کشی کا مظہر نظر آتی ہے۔ اور نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ گذر جانے کے باوجود آج بھی اگر حالات و واقعات کے بین السطور چشمِ حقیقت بیں سے مشاہدہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک جانب ہمارے معاشرے کی عمومی اقدار ' اور تعلیم یافتہ اور مقتدر طبقات کے مجموعی تصورات اور رجحانات ہیں جن پر عہدِ حاضر کی عالمی تہذیب کے زیرِ اثر مادہ پرستی ' الحاد اور اباحیت کی گہری چھاپ ہے ' جن کا تقاضا ہے کہ ملک مغرب کے مروجہ تصورات کے مطابق وطنی قومیت کے اصول پر مبنی ریاست (Nation State) قرار پائے اور مغرب کے سیاسی اور اقتصادی نظام کو سماجی اور تہذیبی اقدار سمیت جوں کا توں اختیار کر لیا جائے۔ اور دوسری طرف مذہبی طبقات اور سیاست کے میدان میں بر سرِ عمل مذہبی جماعتیں ہیں جو عوام کے مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ کے سہارے قانونِ شریعت کی تنفیذ اور اسلام کی تہذیبی اقدار کی ترویج کی جانب زور لگا رہی ہیں۔

اس رسہ کشی کے ضمن میں مذہبی جماعتوں کا یہ دعویٰ تو یقیناً صحیح ہے کہ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور قوانینِ شریعت کے نفاذ میں تاحال کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ہماری میزانِ نتائج میں نفع اور کامیابی کے پلڑے میں یہ وزن کیا کم ہے کہ ہم نے یہاں سیکولر نظام کی جڑیں بھی مضبوط نہیں ہونے دیں!۔۔۔۔ لیکن

قومی اور ملکی سطح پر یہ بات بہت قابلِ غور ہے کہ اس منفی کامیابی (اگر اسے کامیابی قرار دیا جاسکے!) کی قیمت اگر قومی سیاست کے تعطل (Stalemate) کی صورت میں ادا کی جاتی رہی تو شاید ملک ہی ع " آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!" کے مصداق حصے بخرے (Balkanise) ہو کر ختم ہوجائے اور وہ شاخ ہی باقی نہ رہے جس پر نظامِ اسلام اور قانونِ شریعت کے آشیانے بنائے جاسکیں۔ گویا اس رسہ کشی کے جاری رہنے میں اس بات کا بھی اندیشہ موجود ہے کہ رسہ ہی بیچ میں سے ٹوٹ جائے ـــــ مزید برآں اس تعطل میں بھی خلا تو بہرحال موجود نہیں ہے اور اس "Status Quo" کے معنی بھی تو یہی ہیں کہ جاگیرداری نظام بھی جوں کا توں برقرار ہے اور سودی معیشت بھی علیٰ حالہ قائم و دائم ہے اور نفاذِ شریعت ایکٹ بھی نافذ ہوا ہے تو ایسا جسے جملہ مذہبی جماعتوں نے "انسدادِ شریعت ایکٹ" قرار دیا ہے۔ رہی مغربی معاشرت اور اس کے لوازم یعنی عریانی' بے حیائی اور فحاشی تو وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر ہی رہے ہیں!

حاصلِ کلام یہ کہ انتخابی سیاست کے میدان میں سرگرم مذہبی جماعتوں کو اپنی حکمتِ عملی (Strategy) پر نظرِ ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ چنانچہ بعض جماعتیں اس وقت اس انداز سے سوچ بھی رہی ہیں۔ لیکن بحالاتِ موجودہ یہ اندیشہ وہمی اور خیالی نہیں ہے کہ وہ کسی ردِّ عمل کا شکار ہو کر دوسری انتہا کی جانب نکل جائیں اور ماحول کو کم از کم حد تک سازگار بنائے بغیر' اور خود اپنی صفوں کی ترتیب و استواری' اور کارکنوں کی تربیت اور تزکیے کے ناگزیر تقاضے پورے کئے بغیر تصادم کی راہ اختیار کرلیں جس کا نتیجہ ملک و قوم کے حق میں بھی تباہ کن ہوگا اور دین و مذہب کے لئے بھی نہایت افسوس ناک!ـــــ بنا بریں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس منہج نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کو اچھی طرح سمجھا جائے جس کے ذریعے تاریخ انسانی کا پہلا اسلامی انقلاب برپا ہوا تھا اور جسے اختیار کئے بغیر ع "خدایا! آں کرم بارے دگر کن!" کی آرزو شرمندۂ تکمیل نہیں ہوسکتی!

تفکر و تذکر—(۲)

قیام پاکستان اور مذہبی طبقات کی ذمہ داریاں

ویسے تو ہمارا ایمان ہے کہ کائنات میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اذنِ رب کے بغیر رونما نہیں ہوتا لیکن پاکستان کا قیام تو ہر اعتبار سے ایک نہایت غیر معمولی واقعہ تھا اور دنیا کے نقشے پر اس طرح اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر وقت کی عظیم ترین مسلمان سلطنت کا رونما ہو جانا یقیناً مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں کسی بڑی تدبیر کے سلسلے کی کڑی تھا۔ چنانچہ جب صرف ایک ہی سال بعد اسرائیل کا قیام بھی عمل میں آگیا تو یہ گویا اس سنّتِ الٰہی کا ظہور تھا جو حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ "اللہ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی جس کی دوا بھی پیدا نہ کردی ہو!"۔ (بقول حالی "نہیں ہے جہاں میں مرض کوئی ایسا۔ کہ جس کی دوا حق نے کی نہ ہو پیدا!") اور اب بھی، اگرچہ ہم اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باعث ملک کو دو لخت بھی کروا چکے ہیں اور بچا کھچا پاکستان بھی علاقائی، نسلی اور لسانی عصبیتوں کی آماجگاہ ہی نہیں، رزمگاہ بنا ہوا ہے، حقیقت بین نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ع "میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح!" کے مصداق عالمی صیہونیت کی آنکھوں میں کھٹکنے والے سب سے بڑے خار کی حیثیت پاکستان ہی کو حاصل ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ عوام کے تمام طبقات اسے ایک نعمت خداداد اور عطیۂ خداوندی سمجھتے ہوئے ماضی کے تمام اختلافات کو بھلا کر کامل توافق و تعاون کے ساتھ اس کی تعمیر اور ترقی میں لگ جاتے! خاص طور پر تمام مذہبی طبقات کا تو فرضِ عین تھا کہ، خواہ اس سے قبل وہ پاکستان کے حامی رہے تھے یا

مخالف، اور خواہ اس سے پہلے صرف تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے تھے، خواہ اپنے اپنے خیال اور طریقۂ کار کے مطابق پورے ہندوستان میں اسلام کے غلبے کی سعی و جہد کررہے تھے، قیامِ پاکستان کو قدرت کا اشارہ سمجھ کر اب اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرتے اور بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کا شعور حاصل کر کے اپنی اپنی مساعی کا رخ پاکستان کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا گہوارہ بنانے کی مثبت تعمیری جدوجہد کی جانب موڑ دیتے۔

اس کے لئے ایک طرف یہ ضروری تھا کہ ہر گروہ اپنے مزاج کی مناسبت اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے تناسب سے اس عظیم جدوجہد کے کسی ایک شعبے کو سنبھال لیتا اور دوسری طرف یہ لازمی تھا کہ انتشار و افتراق کے تمام رخنوں کو قطعی طور پر بند کردیا جاتا اور قومی قیادت کے ساتھ حتی الامکان تعاون کی روش اختیار کی جاتی۔

وہ مذہبی حلقے جو جمعہ و جماعت، اور درس و خطابت کے ذریعے عوام سے قریب ترین ربط و تعلق رکھتے تھے اور ان میں گہرے اثر و نفوذ کے مالک تھے، مذہبی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے احیاء کے لئے انتہائی مؤثر کام کرسکتے تھے ---- اور جماعتِ اسلامی علمی و فکری سطح پر اسلامی انقلاب اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں دینی اقدار کے احیاء کے لئے قیمتی خدمات سرانجام دے سکتی تھی۔

اس اعتبار سے جماعتِ اسلامی واقعۃً ایسی پوزیشن میں تھی کہ اپنے پیشِ نظر ہمہ گیر اور عالم گیر اسلامی انقلاب کے لئے قیامِ پاکستان کو ایک بہترین موقع کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ مولانا مودودی نے چھ سات سال مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد اور عام سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رہ کر جو کام کیا تھا اس کے نتیجے میں انہوں نے ایک ایسی جمعیت فراہم کرلی تھی جو ایک اچھی بھلی تعداد میں ایسے مخلص اور سرگرم اور ساتھ ہی نظم اور باقاعدگی اور سلیقے اور قرینے کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت سے مسلح کارکنوں پر مشتمل تھی جن میں اپنے مقصد اور نصب العین کا واضح

شعور بھی موجود تھا اور اس کے لئے محنت و مشقت کے مادے اور ایثار و قربانی کے جذبے کی بھی کمی نہ تھی۔

اور سب سے اہم یہ کہ اس جمعیت میں دین و دنیا اور قدیم و جدید کا وہ امتزاج بھی موجود تھا جو اس دور میں دین کی کسی بھی مؤثر خدمت کے لئے لازمی اور لابدی ہے۔ اس اعتبار سے یہ جمعیت مسلمانوں کے جدت پسند اور قدامت پرست طبقات کے مابین ایک "امتِ وسطیٰ" کا رول ادا کر سکتی تھی۔

جہاں تک قومی قیادت کا تعلق ہے اگرچہ اس غریب پر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی مختلف خارجی و داخلی اسباب کی بنا پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا' چنانچہ ملکی بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کے کام تو جیسے کچھ اور جتنے کچھ اس سے بن آئے اس نے کئے' لیکن سیاسی میدان میں قوم کی تنظیم و تربیت اور قومی شعور اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے کا کام وہ بالکل نہ کر پائی۔ تاہم جہاں تک تعاون کا تعلق ہے اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ پاکستان کی پہلی قومی قیادت کی جانب سے اس سلسلے میں تنگ دلی اور بخل کا مظاہرہ قطعاً نہیں ہوا --- اور اس کے باوجود کہ بعض مذہبی حلقوں نے کھلم کھلا قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی تاہم اپنا وقت آنے اور اقتدار پر بلا شرکت غیرے قابض ہونے کے بعد اس نے آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے مستفید ہونے کے معاملے میں مسلم لیگ کے حامیوں اور مخالفوں کے مابین فرق و امتیاز کا کوئی شائبہ بھی کبھی پیدا نہ ہونے دیا---

اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ایک قومی جماعت ہونے کی بنا پر مسلم لیگ کی صفوں میں ہر نقطۂ نظر اور مکتبۂ فکر کے لوگ پائے جاتے تھے' حتیٰ کہ خالص ملحد اور دہریے بھی موجود تھے --- لیکن پاکستان میں اس کی جو پہلی ٹیم بر سرِ اقتدار آئی اس میں مخلص قوم پرست مسلمان بلکہ خاصے مذہبی مزاج اور دینی مذاق کے لوگوں کو ایک فیصلہ کن پوزیشن حاصل تھی اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے بہترین حکمتِ عملی یہ تھی کہ تمام دینی جماعتیں اور مذہبی حلقے ایک طرف اپنی تعلیمی و

تبلیغی سرگرمیوں اور اخلاقی و عملی اصلاح کے کاموں میں مواقع اور وسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمانوں کی آزاد قومی ریاست میں متوقع تھا---- اور دوسری طرف قومی قیادت کے مخلص اور مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرتے---- لیکن افسوس کہ صرف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقائے کار کو چھوڑ کر کہ انہوں نے تو حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بھی بھرپور حصہ لیا تھا' اکثر مذہبی حلقوں نے یا تو لاتعلقی کی روش برقرار رکھی یا معاندانہ انداز اختیار کرلیا۔

علمائے دین کی ایک عظیم اکثریت نے قومی و سیاسی زندگی سے ایک گونہ لاتعلقی کی اس روش کو برقرار رکھا جس پر وہ تقریباً پون صدی سے عمل پیرا تھے اور پاکستان آکر بھی وہ حسبِ سابق کلیۃً تعلیمی و تدریسی مشاغل میں منہمک ہوگئے۔ چنانچہ یہ تو ضرور ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی نئی اور عظیم دینی درسگاہیں پاکستان میں قائم ہوگئیں اور اس اعتبار سے یقیناً ایک قابل قدر اور بیش قیمت کام سرانجام پا گیا---- لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی ایک بڑی اکثریت نے نہ صرف یہ کہ اپنے تعلیمی و تدریسی معمولات حتیٰ کہ نصاب تک میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ اپنے ذہنوں میں نئے مسلمان حکمرانوں کو بالکل اسی مقام پر رکھ کر اپنے سابقہ طریقِ کار پر عمل پیرا رہے جس پر ان سے پہلے کے حکمران تھے۔

بدقسمتی سے قومی قیادت کے بعض عناصر اور پاکستان کی مختلف سروسز کے اعلیٰ افسروں کی اکثریت نے مغربی طرزِ فکر اور یورپی طرز بودوباش کو جس حد تک اختیار کر لیا تھا اس کے پیشِ نظر مذہبی طبقات کا یہ طرزِ عمل کسی حد تک فطری بھی تھا۔ بہر نوع ہوا یہ کہ اگرچہ علماء کی ایک بڑی اکثریت نے اپنے آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دور ہی رکھا لیکن اس مغائرت اور بُعد کی بنا پر یہ بہرحال ہوا کہ عدمِ اطمینان کی ایک کیفیت ان میں مستقل طور پر موجود رہی جس سے مختلف سیاسی گروہ وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہے!

رہیں مذہبی جماعتیں تو افسوس کہ ان کی اکثریت نے زیادہ مناسب یہ سمجھا کہ قومی قیادت کے مدِّ مقابل کی حیثیت اختیار کرکے انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں اتریں اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں تاکہ اس طرح نظامِ اسلام اور نفاذِ شریعت کا راستہ ہموار ہو سکے!۔

پاکستان کی انتخابی سیاست کے میدان میں جو مذہبی جماعت سب سے پہلے داخل ہوئی وہ جماعتِ اسلامی تھی۔ جس نے "انقلاب قیادت" کا نعرہ تو ۴۹۔۴۸ء ہی میں لگا دیا تھا، لیکن انتخابات میں عملاً حصہ لینے کے لئے ۱۹۵۰ء میں مہم کا آغاز کیا۔ اور ۱۹۵۱ء میں بڑے طمطراق کے ساتھ پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ اس کے لئے جماعت نے جو طریق کار اختیار کیا وہ بہت بلند وبالا اور اعلیٰ و ارفع تھا۔ چنانچہ امیدواری کو حرام اور پارٹی ٹکٹ کو لعنت قرار دے کر "ووٹر کا عہد نامہ" کی بنیاد پر پنچائتیں تشکیل دی گئیں اور پھر ان پنچائتوں نے ہی امید واروں کو بھی نامزد کیا اور جملہ اخراجات بھی برداشت کئے۔ جماعت کو امید تھی کہ اسے چالیس کے لگ بھگ سیٹیں مل جائیں گی، لیکن سیاست کے میدان میں چونکہ ٹھوس حقائق و واقعات ہی کی عکاسی ہوتی ہے لہٰذا جماعت کو اپنے اس طریقِ کار کے ذریعے کوئی ایک سیٹ بھی نہ مل سکی --- تاہم اس کے بعد بھی جماعت ع "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!" کے مطابق مسلسل ع "زمانہ باتونہ سازد تو بازمانہ بساز!" پر عمل کرتے ہوئے اپنے اعلیٰ اور ارفع طریقِ کار سے تائب ہو کر مروجہ طریقوں ہی کو اختیار کرکے مسلسل اس میدان میں بر سرِ کار رہی اور آج تک ہے!--- اگرچہ حاصل اس ساری تگ و دو کا یہ رہا کہ انیس برس بعد ۱۹۷۰ء میں قومی اسمبلی کے لئے مغربی پاکستان سے کل چار نشستیں حاصل ہوئیں، اور پھر سترہ اٹھارہ برس بعد بھی یہ تعداد پانچ سات سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ (۱۹۹۰ء کے انتخابات کا معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ "اسلامی جمہوری اتحاد" کے تحت لڑا گیا!)

ادھر دوسرے مذہبی طبقات نے سوچا کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

کے مصداق کیوں نہ ہم بھی اس میدان میں قسمت آزمائی کریں جبکہ جمعہ و جماعت کے عظیم نظام کے ذریعے ہمارا رابطۂ عوام کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے! چنانچہ یکے بعد دیگرے جمعیت علماء اسلام' جمعیت علماء پاکستان' اور جمعیتِ اہلحدیث بھی علیحدہ علیحدہ میدانِ سیاست میں اتریں۔ ان میں سے جمعیت اہلحدیث کا حلقہ تو ظاہر ہے کہ بہت محدود ہے اور اسے پورے ملک میں ایک آدھ سے زیادہ نشست کی امید ہو ہی نہیں سکتی' البتہ جمعیت علماءِ اسلام کا اثر و نفوذ پاکستان کی شمال مغربی پختون پٹی میں' جو سرحد میں مالاکنڈ کے علاقے سے شروع ہو کر بلوچستان میں چمن سے آگے تک پھیلی ہوئی ہے' خاصا گہرا ہے۔ لہٰذا اسے وہاں سے کچھ نہ کچھ سیٹیں مل جاتی ہیں۔ (اگرچہ حال ہی میں بلوچستان میں جو نسلی کشاکش شدت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی ہے اس سے اندیشہ ہے کہ وہاں کے پختونوں میں بھی قوم پرستوں کا عمل دخل بڑھ جائے گا جس سے جمعیتِ علماءِ اسلام کے سیاسی اثر و نفوذ میں کمی ہوگی۔) رہی جمعیتِ علماءِ پاکستان تو اگرچہ مذہبی تصورات کے اعتبار سے وہ واقعتاً ملک کے عوام کے "سوادِ اعظم" کی نمائندہ اور ترجمان ہے تاہم چونکہ یہی سوادِ اعظم ملک کے دیہی علاقوں میں وڈیروں اور جاگیرداروں کی شکار گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں' لہٰذا اس کے سیاسی اثرات زیادہ تر شہروں تک محدود تھے' اور وہاں سے بھی کم از کم سندھ کی حد تک تو ایم کیو ایم نے فی الوقت جماعتِ اسلامی کی طرح جمعیتِ علماءِ پاکستان کے اثرات بھی بالکل زائل کردئے ہیں! مستقبل کا حال اللہ ہی کے علم میں ہے!

الغرض بحالاتِ موجودہ الیکشن کے ذریعے اسلام کے مقصد (Cause) کی جانب پیش قدمی تو ممکن تھی ہی نہیں' واقعہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کو بھی تا حال حکومت اور اقتدار میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ملا۔ دوسری طرف اس میزانیۂ نفع و نقصان میں نقصانات کا پلڑا بہت بھاری ہے' جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:۔

۱) سب سے پہلا اور اہم ترین نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام ایک جماعتی مسئلہ اور الیکشن ایشو بن گیا تو مدافعت کے تقاضے کے طور پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' ڈاکٹر محمود حسین' سردار عبدالرب نشتر اور مسٹر اے۔ کے بروہی ایسے لوگوں کو اسلامی آئین و قانون کے مطالبے کے مقابلے میں آنا پڑا۔ گویا جن لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں ملک و ملت کی مصلحت تھی' انہی کو مخالفین کی صف میں کھڑے ہونے پر مجبور کردیا گیا۔

۲) چونکہ قومی قیادت مختلف اسباب کی بناء پر از خود مضمحل بھی تھی اور داخلی انتشار سے دو چار بھی' لہٰذا یہ خارجی حملہ بہت مؤثر ثابت ہوا اور قومی قیادت زیادہ تیزی کے ساتھ منظرِعام سے ہٹ گئی' چنانچہ مغربی پاکستان میں سرحد کے سابق خدائی خدمتگاروں اور پنجاب کے سابق یونینسٹوں پر مشتمل ری پبلکن پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔

۳) چونکہ مذہبی جماعتوں میں سے اکثر کی اساس فرقہ واریت پر تھی لہٰذا ان کی الیکشن میں ایک دوسرے کے مدِمقابل کی حیثیت سے شرکت کے نتیجے میں فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا اور اس کی تندی اور تلخی میں بہت اضافہ ہوگیا۔

۴) چونکہ ان میں سے کسی کا بھی خود کوئی وسیع اور ملک گیر عوامی حلقۂ اثر (Base) نہیں تھا اور سیاست کے بازار میں اصل سکہ زمینداری' جاگیرداری اور سرمایہ داری ہی کا چل رہا تھا لہٰذا ہر مذہبی جماعت مختلف مواقع پر کسی نہ کسی سیکولر مزاج سیاسی جماعت کا ضمیمہ بن کر اس کی تقویت کا ذریعہ بنی!

۵) ان سیاست دانوں کے ساتھ میل جول' نشست و برخواست اور اکل و شرب اور ان کی شادی غمی کی تقریبات میں شرکت کے باعث خود ان پر وڈیروں اور سرمایہ داروں کا رنگ چڑھتا چلا گیا (جس کی نمایاں ترین مثال حال ہی میں سامنے آئی کہ ایک اسلامی تحریک کے علمبردار اور انقلابی اسلامی جماعت کے امیر کے صاحب زادے کی شادی شان و شوکت اور دھوم دھڑکے میں بہت سے نوابوں اور کروڑ پتی

لوگوں کو پیچھے چھوڑ گئی!)

۶) چونکہ تقریباً تمام فعال مذہبی جماعتوں کی توانائیوں کا اکثر و بیشتر حصہ اس سیاسی عمل میں صرف ہوگیا لہٰذا نہ عوام کی دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح و ترقی کا کام مؤثر حد تک ہوسکا، نہ معاشرے کے بلند تر طبقات میں علمی و فکری سطح پر اسلامی انقلاب اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں دینی اقدار کے احیاء کا حق ادا کیا جاسکا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی معاشرے کی ہیئت ترکیبی میں کوئی بنیادی فرق واقع نہیں ہوا۔

۷) آخری اور سب سے زیادہ افسوسناک "نقصان" یہ کہ چونکہ الیکشن میں حصہ لینے کے لئے عوامی نعروں کی ضرورت ہوتی ہے اور عوامی نعرہ وہی بن سکتا ہے جو عوام کے جذبات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن کی سطح کے مطابق اور فہم کے قریب تر ہو، لہٰذا سارا زور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی (سسٹم آف سوشل جسٹس) کی بجائے قانونِ شریعت پر ہوگیا اور اس کے ضمن میں بھی بس کچھ حدود و تعزیرات ہی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جیسے اصل اہمیت نظام کی ہوتی ہے، قانون تو اس کے تابع ہوتا ہے بلکہ اسے سہارا دیتا ہے، اسی طرح اسلام میں بھی اصل اہمیت دین کی ہے جو آدمؑ سے اس دم تک ایک ہی ہے، شریعت اس کے تابع ہے اور پہلے بھی اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہا اور اب بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، لہٰذا آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے اصول و فروع اور اہداف و نتائج کا فہم و شعور عام کیا جائے۔ تاکہ ایک حقیقی اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہوسکے۔

علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ افکار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اور ان کے اور ہم سب کے آقا اور مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

"آنے والے دور" کے ضمن میں جو دھندلی نہیں، واضح اور حتمی پیشینگوئیاں کی ہیں ان کے مطابق ایک جانب دجالِ اکبر کا ظہور اب بالکل سامنے کی بات ہے جس کے ہاتھوں تمام مسلمانوں اور خاص طور پر عالمِ عرب پر بہت کٹھن وقت آنے والا ہے، تو دوسری جانب اس کے بعد ۔

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

کے مطابق اسلام کے جس عالمی غلبے کی واضح خبر دی گئی ہے اس کی بھی تمہید شروع ہوچکی ہے اور ہر صاحبِ بصیرت دیکھ رہا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز یہی خطۂ ارض بنے گا جس میں پاکستان اور افغانستان واقع ہیں ---- لہٰذا حالات کا شدید تقاضا ہے کہ تمام فعال دینی عناصر وقت کی نزاکت، اپنے کردار کی اہمیت اور اب تک کے میزانیہ نفع و نقصان کے پیشِ نظر آئندہ کا لائحہ عمل از سرِ نو طے کریں ۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۵۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت، قیمت فی نسخہ ۵/- روپے

تفکر و تذکر ـــ (۳)

پاکستان سیکولرزم اور فنڈا منٹلزم کے فیصلہ کن دوراہے پر!

چند ماہ قبل ان کالموں میں عرض کیا گیا تھا کہ پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں نے جو حکمتِ عملی اختیار کی اس کے نتیجے میں یہاں ایک تعطل کی سی کیفیت پیدا ہو گئی کہ نہ موجودہ دنیا کے عام رجحانات کے مطابق سیکولرزم 'نیشنلزم' اور فلاحی مقاصد کی جانب پیشقدمی ہو سکی' نہ فیصلہ کن انداز میں دین و مذہب ہی کے رخ کو اختیار کیا جا سکا۔ اور اگرچہ بعض مذہبی حلقے یہ کریڈٹ لیتے ہیں کہ ملک اور معاشرہ کو خالص سیکولرزم کی جانب بگٹٹ دوڑنے سے روک لینا ہماری بڑی کامیابی ہے اور ان کا یہ دعویٰ ایک حد تک درست بھی ہے' لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو تعطل کی اس کیفیت کا زیادہ دیر تک برقرار رہنا ملک و قوم دونوں کے حق میں نہایت مضر اور تشویشناک ہے۔

پاکستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھنے والا ہر شخص محسوس کر رہا ہے کہ پچھلے دو ایک ماہ سے یہ صورت تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے۔ اور ہم قومی اعتبار سے اس دوراہے پر پہنچ گئے ہیں جہاں "یا چناں کن یا چنیں" کے انداز میں صاف اور اعلانیہ سیکولرزم اور اسلامی فنڈا منٹلزم میں سے ایک راستے کا انتخاب ناگزیر ہے' اور خواہ کسی کی سیاسی مصلحتیں اس کی کتنی ہی متقاضی ہوں' منافقانہ دو عملی کی اس روش کا برقرار رکھنا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے جس پر ہم من حیث القوم اب تک عمل پیرا رہے ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ "سیکولرزم" سے ہماری مراد "لامذہبیت" ہرگز نہیں ہے' بلکہ ہمارے نزدیک سیکولرزم کو تو "ہمہ مذہبیت" قرار دیا

جانا چاہئے' اس لئے کہ اس میں شہریوں کے ذاتی اور نجی معاملے کی حیثیت سے جملہ مذاہب کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ البتہ اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے سیکولرزم کو "لادینیت" سے تعبیر کرنا یقیناً درست ہے۔ (بقول اقبال ؏ "لادینی ولاطینی کس پیچ میں الجھا تو!") اس لئے کہ اس نظام میں ملک و قوم کے اجتماعی معاملات یعنی دستور و قانون' سماجی و معاشرتی اقدار' اور معاشی و سیاسی نظام کی سطح پر کسی بھی مذہب یا آسمانی ہدایت کی پابندی کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور جملہ مذاہب کو شہریوں کا صرف نجی معاملہ قرار دے کر' کم از کم دستوری اور قانونی اعتبار سے' مساوی قرار دے دیا جاتا ہے!

اس نقطۂ نظر کے برعکس جس چیز کو آج "فنڈامنٹلزم" سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہ کسی قوم یا گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارا مذہب دراصل مذہب نہیں "دین" ہے' جو ایک کامل ضابطۂ حیات ہونے کے ناتے زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں دائروں پر اپنی مکمل حکمرانی چاہتا ہے۔ اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ وہ دعویٰ ہے جو موجودہ دنیا میں صرف مسلمانوں' اور ان کی بھی صرف بعض "احیائی تحریکوں" کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کی اکثریت حتیٰ کہ بعض مؤثر و موقر مذہبی حلقے بھی صدیوں کے تعامل اور خاص طور پر ڈیڑھ دو صدی کی مغربی اقوام کی غلامی کے باعث اسلام کے محدود مذہبی تصور کو ذہناً اور عملاً قبول کئے ہوئے ہیں!۔ گویا دنیا میں جس نئے تصادم کی پیشینگوئی علامہ اقبال مرحوم نے اب سے ساٹھ ستر سال قبل اپنے ان اشعار میں کی تھی کہ ۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پا مردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس میں ایک جانب سیکولرزم اور لبرلزم کے پردے میں "ابلیسیت" کی عالمگیر قوت

ہے تو دوسری جانب عالم اسلامی کی صرف احیائی اسلامی تحریکیں اور ان کے زیر اثر عوام کے محدود حلقے! گویا معاملہ وہی ہے کہ' ع "الجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!"

اس عالمی تناظر میں اگر نگاہوں کو پاکستان کے قومی منظر پر مرکوز کر دیا جائے تو جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ :ایک جانب ایک بڑی سیاسی جماعت پاکستان پیپلزپارٹی ہے جس کا عوامی اثر ورسوخ بھی قابل لحاظ ہے' اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اس وقت ملک کی واحد' واقعی اور عملی اپوزیشن پارٹی کا رول ادا کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں جن کی اکثریت حال ہی میں این ڈی اے کے نام سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئی ہے' اگرچہ ان کی مجموعی حیثیت اور اہمیت بھی قابل لحاظ نہیں ہے۔ تاہم پیپلزپارٹی کی طرح یہ سب بھی کھلم کھلا اور اعلانیہ طور پر سیکولرزم' لبرلزم' اور نیشنلزم کی قائل ہی نہیں باضابطہ پرچارک ہیں' (اس وقت صرف سرحد کی اے این پی' جو اصلاً تو اسی قبیل کی شے ہے' کچھ ذاتی رنجشوں اور وقتی مصلحتوں کے باعث اس حلقے سے باہر رہ گئی ہے!)اور ان تمام جماعتوں کو اس بات کا کریڈٹ بہرحال دیا جانا چاہئے کہ وہ منافقت سے کام نہیں لیتیں بلکہ اپنے نظریات اور ترجیحات کا اظہار اعلانیہ اور برملا کرتی ہیں! ——————

دوسری جانب کچھ مذہبی جماعتیں ہیں جو شریعت کی غیر مشروط اور بلااستثناء بالادستی کی علمبردار ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو آئی جے آئی میں شامل ہی نہیں ہوئی تھیں اور بعض وہ ہیں جو اس اتحاد میں شامل ہو کر کچھ اس کے سہارے چند اضافی سیٹیں حاصل کر کے اور کچھ اپنی امداد سے مسلم لیگ کو بعض اہم سیٹیں دلوا کر موجودہ حکومت کو برسراقتدار لانے میں تو شریک تھیں لیکن بعد میں اس کی پالیسی سے مایوس ہو کر ایک ایک کر کے علیحدہ ہوتی چلی گئیں ——— بہرحال اس وقت وہ سب بھی حکومت سے باہر ہیں' اگرچہ باضابطہ "اپوزیشن" نہیں کہلا سکتیں۔ درمیان میں مسلم لیگ اور اس کی مرکزی حکومت ہے جو اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جسے

فیڈرل شریعت کورٹ کے سود سے متعلق تاریخ ساز فیصلے نے فیصلہ کن بنا دیا ہے! اس لئے کہ مسلم لیگ کا اگر کوئی تھوڑا بہت عوامی "بھرم" ہے تو وہ صرف اسلام اور نظریۂ پاکستان کے حوالے سے ہے اور فیڈرل شریعت کورٹ نے بینک انٹرسٹ کو بھی (بالکل بجا طور پر) ربا قرار دیدیا ہے جو شریعت اسلامی کی رو سے صرف حرام ہی نہیں' تمام حرام چیزوں میں سب سے بڑھ کر ہے' جبکہ مسلم لیگ کی حکومت کو ملک کے معاشی استحکام اور عوام کی خوشحالی کا واحد راستہ یہ نظر آتا ہے کہ مغرب کی آزاد معیشت اور مارکٹ اکانومی کو اس کے جملہ لوازم سمیت جوں کا توں اختیار کر کے بیرونی سرمایہ کو پاکستان آنے کی دعوت دی جائے! الغرض ایک شدید مخمصہ ہے جس سے موجودہ حکومت دوچار ہو گئی ہے ——— مزید برآں اس معاملے میں زیادہ دیر تک تذبذب اور گومگو میں گرفتار رہنے کی صورت میں بھی "سیاسی موت" یقینی نظر آ رہی ہے۔

اندریں حالات نظر یہی آ رہا ہے کہ تاریخ کا جبر ہماری قومی زندگی کے سفینے کو کھلے اور عریاں سیکولرزم کی جانب دھکیل دے گا۔ اور کم از کم فوری اور عارضی طور پر پاکستانی قوم بھی عملاً وہی راستہ اختیار کر لے گی جو اب سے ستر برس قبل ترک قوم نے مصطفیٰ کمال پاشا کی زیرِ قیادت اختیار کیا تھا۔ (سوائے ان چند انتہا پسندانہ اقدامات کے جو ردِّ عمل کی شدت کے مظہر تھے' جیسے عربی زبان سے بیزاری' رسم الخط کی تبدیلی' اور یورپی لباس کا لزوم وغیرہ۔)

اب اس سے قبل کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ اگر یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا تو اس کے فوری اور دیرپا نتائج کیا ہوں گے' ایک نظر اس پر بھی ڈال لی جائے کہ اسلام کے بلند بانگ دعووں' اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" کے فلک شگاف نعروں کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں اس حادثے کے اسباب کیا ہیں؟۔ ہمارے نزدیک اس کے دو اسباب تو ع "نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں!" کے مصداق طویل تاریخی پس منظر کے حامل ہیں' اور ایک سبب فوری

اور حالیہ ہے۔

مقدّم الذکر اسباب میں سے پہلا یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرواکر پاکستان کو منصۂ شہود پر لانے والی جماعت مسلم لیگ اپنے مزاج اور اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے خالص سیکولر قومی جماعت تھی۔ اور جیسے کہ ہم کچھ عرصہ قبل ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں، تحریکِ پاکستان کا اصل اور فیصلہ کن جذبہ محرکہ "دفاعی" تھا "احیائی" نہیں! چنانچہ یہی حقیقت ہے جسے حال ہی میں ایک وفاقی وزیرِ مملکت نے ذرا ڈھکے چھپے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ: "پاکستان اسلام کے لئے وجود میں آیا تھا' بنیاد پرستی کے لئے نہیں!" ——— اور بعض دوسرے زیادہ جری اور بے باک مسلم لیگی لیڈر بغیر کسی لگی لپٹی کے ان الفاظ میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ "پاکستان مسلمانوں کے لئے بنایا گیا تھا' اسلام کے لئے نہیں!"

ہم اِس وقت بحمد اللہ اپنی قومی زندگی کے پینتالیس سال پورے کر چکے ہیں' گویا ازروئے قرآن (سورۂ احقاف آیت ۱۵) ہمیں قومی اعتبار سے شعوری بلوغ کی عمر کو پہنچے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں اس قابل ہونا چاہئے کہ حقائق کے ادراک' اعتراف' اور اظہار و اعلان میں کوئی باک محسوس نہ کریں۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہئے کہ بانئ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح سیکولر ذہن اور مزاج کے حامل انسان تھے۔ چنانچہ ان کی ۱۱ر اگست ۴۷ء کی تقریر کا یہ جملہ اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ:

> "عنقریب یہاں (پاکستان میں) نہ ہندو ہندو رہیں گے' نہ مسلمان مسلمان رہیں گے' مذہبی اعتبار سے نہیں' اس لئے کہ مذہب تو افراد کا نجی معاملہ ہوتا ہے' بلکہ سیاسی اعتبار سے!"

اور ظاہر ہے کہ سیکولرزم کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف ممکن ہی نہیں ہے!

قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے زعماء نے اسلام کا نعرہ ضرور لگایا تھا لیکن ایک تو ان کا تصور اسلام یا اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے عبارت تھا یا زیادہ تر "حریت' اخوت اور مساوات" پر مبنی سماجی عدل سے' شریعت کے تفصیلی

احکام یا حدود و تعزیرات کو اس میں کوئی اہم مقام حاصل نہیں تھا۔ دوسرے اس نعرے سے اصل مقصود مسلمان قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا جس کے بغیر ان کے تہذیبی و ثقافتی تشخص کے بقاء اور دنیوی فلاح و بہبود کی جنگ ہرگز نہیں لڑی جاسکتی تھی۔ لیکن اس جنگ سے اصل مقصود بہرصورت مسلمان قوم کا "دفاع" اور اسے ہندو اکثریت کے تہذیبی غلبے' اور معاشی استحصال سے بچانا تھا۔ اور یہ مقصد بھی ہرگز نہ غلط تھا نہ گھٹیا۔ اس لئے کہ انبیاء اور رسولوں کی تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک جلیل القدر پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) کو بنیادی طور پر ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم (بنی اسرائیل) کو غلامی کے شکنجے سے نجات دلانے کے لئے ہی مبعوث فرمایا تھا۔ مزید برآں قائدِ اعظم اور ان کے رفقاء ہرگز ہرگز نہ جھوٹے تھے نہ دغاباز بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جب مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل آزاد مملکت وجود میں آجائے گی تو اسلامی تہذیب وثقافت کے احیاء اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جب سیکولر سیاست کے اصول کے مطابق بھی قانون سازی کا اختیار اکثریت ہی کو حاصل ہو گا تو قوانینِ شریعت کے نفاذ میں بھی کوئی خارجی رکاوٹ حائل نہیں رہے گی! بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ تحریکِ پاکستان ہرگز کوئی مذہبی تحریک نہیں تھی' بلکہ صرف قومی تحریک تھی اور مسلم لیگ ہرگز مذہبی یا احیائی جماعت نہیں تھی بلکہ سیکولر مزاج کی تنظیم تھی' یہی وجہ ہے کہ اس میں کیمونسٹ بھی شامل تھے اور دہریئے بھی' اور صرف شیعہ اور سنی ہی نہیں' آغا خانی بھی شریک تھے اور قادیانی بھی!

حاصلِ کلام یہ کہ ------ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کا مسلمانانِ ہند پر یہ احسان بھی بہت بڑا ہے کہ انہوں نے پاکستان بنوا دیا اور مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت دلوا دی' اب اسے حقیقی معنی میں اسلامی ریاست بنانا اس ملک کے عوام کا کام تھا' یا بالخصوص دینی اور مذہبی جماعتوں کا! ------ اور ان میں بھی سب سے بڑھ کر "احیائی تحریکوں" کا!!

اگر یہ اندیشہ کہ مستقبل قریب میں پاکستان سطحی مذہبیت کا لبادہ اتار کر عریاں سیکولرزم کی راہ اختیار کر لے گا' درست ثابت ہوا تو اس کا دوسرا اور زیادہ قابلِ افسوس تاریخی سبب یہ ہوگا کہ ملک کی مذہبی اور دینی جماعتوں نے قوم کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقوں میں ذہنی انقلاب برپا کرنے' عوام کے اخلاق اور سیرت وکردار کی تطہیرو تعمیر' اور دین کے حق میں ایک منظم اور تربیت یافتہ رائے عامہ پیدا کرنے کے کٹھن اور محنت طلب کام کو چھوڑ کر مسلم لیگ ہی کی وراثت یعنی "اسلام کے نعرے" کو اپنا کر سیاست کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ اور اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ ایک خالص احیائی تحریک بھی' جو ۴۱۔ ۱۹۴۰ء میں قومی جدوجہد کو "غیر اسلامی" قرار دے کر خالص اصولی اسلامی انقلابی جدوجہد کی راہ پر گامزن ہوئی تھی' قیامِ پاکستان کے بعد اپنا اصولی اسلامی انقلابی لباس اتار کر ملکی سیاست کے حمام اور کشاکشِ اقتدار کے اکھاڑے میں داخل ہو گئی۔

ان جملہ مذہبی اور دینی جماعتوں کی ۱۹۷۷ء تک کی تیس سالہ مساعی کا کل حاصل یا تو قراردادِ مقاصد تھی جو دستور ملکی میں "دیباچہ" کی حیثیت سے شامل تھی' یا چند مزید "رہنما اصول" تھے جن کی حیثیت "وعدۂ فردا" کے سوا کچھ نہیں تھی' یا پھر عوام میں اسلام کا بلند بانگ نعرہ تھا جو پی این اے کی تحریک المعروف بہ "تحریک نظامِ مصطفیٰ" میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا! جسے ایک چیف آف دی آرمی اسٹاف نے اپنا "متبنی" بنا کر ایوانِ حکومت میں لا بٹھایا اور پھر اس کے "سرپرست" کی حیثیت سے پورے گیارہ برس تک کوسِ لِمَنِ المُلک بجایا۔ اور اس دوران میں اسلام کے نعرے کی سرپرستی کے جواز کے طور پر ایک تو قراردادِ مقاصد کا رتبہ کسی قدر بلند کر دیا کہ اسے دستور کا جزو بنا دیا' لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کی متضاد دفعات کو بھی منسوخ نہیں کیا ـــــــ اور دوسرے فیڈرل شریعت کورٹ بنا دی' لیکن یہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ اسے دو ہتھکڑیاں بھی پہنا دیں (یعنی عائلی اور مالی قوانین کے ضمن میں پابندی) اور دو بیڑیاں بھی (یعنی ملکی دستور اور عدالتی قواعد کا

استثناء) تاکہ اسلام کا نعرہ بھی برقرار بلکہ سدا بہار رہے اور "گلشن کا کاروبار" بھی جوں کا توں چلتا رہے --- اور اس میں بھی کوئی رکاوٹ واقع نہ ہو۔ اس پورے معاملے میں کمی صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے ایک ہتھکڑی "موقت" تھی جو مدتِ معینہ کے گذر جانے سے خود بخود کھل گئی۔ چنانچہ فیڈرل شریعت کورٹ نے وہ عظیم فیصلہ صادر کر دیا جس نے اس ملک میں دو عملی کے مزید جاری رہنے کو ناممکن بنا دیا ہے'---- اور فیصلہ کن دوراہہ عین سامنے لا کھڑا کیا ہے!

چنانچہ یہی ہے وہ فوری اور حالیہ سبب جس کے باعث موجودہ مسلم لیگی قیادت سخت مخمصہ میں مبتلا ہوگئی ہے اور اس کے لئے "یا چناں کن یا چنیں" کے حتمی اور قطعی فیصلے کو مؤخر یا ملتوی کرنا ممکن نہیں رہا۔ ساتھ ہی اس مخمصے کو موجودہ عالمی حالات نے نہایت گھمبیر بنادیا ہے۔ اس لئے کہ موجودہ دنیا "بائی پولر" کی بجائے "یونی پولر" بن چکی ہے اور امریکہ کو دو سپر پاورز میں سے ایک کی بجائے دنیا کی واحد سپریم پاور کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک جانب چھوٹے ملکوں کے "آپشن" بہت محدود ہوگئے ہیں اور دوسری جانب امریکہ اپنے نظریات اور اصول' اپنی تہذیب و ثقافت' اور اپنی صوابدید اور ترجیحات کو پوری دنیا پر مسلط کرنے پر تلا ہوا ہے! اور اپنے سیاسی فیصلوں کو اقوامِ متحدہ' اور اپنی معاشی حکمتِ عملی کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ذریعے ترقی پذیر یا صحیح تر الفاظ میں غیر ترقی یافتہ ممالک پر زبردستی ٹھونسنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے! لہٰذا ان حالات میں امریکہ کی مخالفت اور مقابلے کی باتیں زبان سے کرنا تو آسان ہے' عملاً صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ یا تو قطعی مایوسی اور فرسٹریشن میں "تنگ آمد بجنگ آمد" والا معاملہ ہو جائے یا ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کی بنا پر وہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ ۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے!

لہٰذا اگرچہ موجودہ قیادت نے فی الحال مروجہ میکیا ویلین سیاست کے اصولوں

کے مطابق اپنے لئے دونوں راستے کھلے رکھے ہوئے ہیں، یعنی ایک جانب کچھ "مذہبی شو بوائے" بھی کھڑے کر رکھے ہیں جو وقفہ وقفہ سے شریعت کی کامل بالادستی والی دستوری ترمیم کی نوید قوم کو سناتے رہتے ہیں کہ ۔

آتے آتے یونہی دم بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے!

تاکہ اس کا امکان برقرار رہے کہ اگر کسی سبب سے اقتدار کی زمین قدموں تلے سے کھسکتی محسوس ہو تو اس ترمیم کابل اسمبلی میں پیش کر کے، اس کی نامنظوری کا الزام اپوزیشن پر ڈال کر خود اگلے راؤنڈ کے لئے "شہیدِ شریعت" کی صورت اختیار کر سکیں ـــــ اور دوسری جانب اپنے کچھ دوسرے ساتھیوں کو آزادی دی ہوئی ہے کہ نہ صرف ملائیت اور فنڈا منٹلزم کو گالیاں دیں، اور کھلم کھلا شریعت کے احکام کی مخالفت کریں، ـــــ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر فیڈرل شریعت کورٹ سمیت دستور میں جو دوسری غیر مؤثر مذہبی دفعات کسی طرح در آئی ہیں ان سب کی بھی بساط کو الٹ کر رکھ دینے کے عزم کا اعلان کریں!

اس قسم کی تمام باتیں اس وقت جس دھڑلّے سے کی جارہی ہیں اس کے دو پہلو قابلِ توجہ ہیں: ایک یہ کہ ان کے کہنے والوں کا ملکی کھونٹا بھی یقیناً مضبوط ہے، اور دوسرے یہ کہ ان کی یہ راگنی اِس وقت پوری دنیا کے راگ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اور جس عالمی تہذیب کا اس وقت کرۂ ارضی پر غلبہ اور قبضہ ہے ان کا موقف اس کے ساتھ کامل موافقت کا حامل ہے! جبکہ اس کے برعکس اسلامی فنڈا منٹلزم کے خلاف فراعنۂ وقت اسی اندیشے اور خوف کی بنا پر اپنی جملہ قوتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں جس کا ذکر سورہ طٰہٰ کی آیت ۶۳ میں ہوا ہے، یعنی یہ کہ اس سے ہماری "مثالی" تہذیب و ثقافت، اور "اعلیٰ" اقدارِ حیات کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ (اگرچہ ان کی نئی اسٹریٹجی یہ ہے کہ خود پس منظر میں رہ کر اور غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ کر مسلمان ممالک کے سیکولر اور لبرل عناصر ہی کو اپنے اپنے ملکوں کی فنڈا منٹلسٹ

قوتوں کے خلاف اکسایا بھی جائے اور مدد بھی دی جائے)۔

ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ قابلِ معافی ہیں جنہیں اس وقت صرف ایک ہی آپشن کھلا نظر آرہا ہے' اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ قوم یہی راستہ اختیار کرلے گی' خواہ ایسا موجودہ مسلم لیگی حکومت کے ذریعے ہو' خواہ کسی متبادل سیاسی قیادت کے ذریعے' خواہ کسی تیسری قوت کے زیرِ قیادت!

اب آیئے کہ ایک نظر اس کے ممکنہ نتائج پر بھی ڈال لیں ---- ان سطور کے راقم کو اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اگر پاکستان کی مسلمان قوم اس رخ کو مستقل طور پر اختیار کرلے تو پاکستان کا جواز ختم ہو جائے گا ---- اور خاکم بدہن' نہ صرف یہ کہ ملک شکست وریخت کا شکار ہو کر دنیا کے نقشے سے اسی طرح غائب ہو جائے گا جیسے حال ہی میں سوویٹ یونین ہو چکی ہے' بلکہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" کے فلک شگاف نعروں کی صورت میں کئے گئے عوامی اور اجتماعی عہد سے بیوفائی اور غداری کی سزا ایسے عبرتناک عذاب کی صورت میں ملے گی کہ ۷۱ء کی ذلت اور رسوائی بھی ماند پڑ کر رہ جائے گی ------- لیکن راقم کو گذشتہ چار صدیوں کی تاریخ اور مستقبل کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کی بنا پر یقین ہے کہ پاکستان کی قومی زندگی کا یہ دور عارضی ہوگا اور اس کے شر سے ان شاء اللہ جلد ہی یہ خیر برآمد ہو جائے گا کہ یہاں کی مذہبی اور بالخصوص احیائی قوتوں کو "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" ---- اور ؎

"تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے!"

کے مصداق ہوش آجائے گا اور وہ اپنے طریقِ کار پر نظرثانی کے لئے آمادہ ہو جائیں گی۔ اور وہ صورت پیدا ہو جائے گی کہ ؎

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

اور اگر ایسا ہو جائے تو بحمد اللہ اس قوم کے پاس قافلۂ ملت کے حدی خواں، مصورِ پاکستان اور مجددِ فکر اسلامی علامہ اقبال کے احیائی نظریات اور تصورات اور انقلابی جذبے کی بیش قیمت متاع بھی موجود ہے۔ پھر اس کے عوام کے سوادِ اعظم کے دلوں میں عشقِ مصطفیٰؐ کی وہ دولت بھی موجود ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اُوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اُوست!

پھر مختلف تبلیغی اور دعوتی تحریکوں کا سرمایہ تدین و تقویٰ بھی ہے جو اگر صرف ایک قدم آگے بڑھا لے یعنی "امر بالمعروف" کے ساتھ ساتھ "نہی عن المنکر" کو بھی عملاً اختیار کر لے تو فنڈا مسئلوم کے حق میں عوامی قوت کا ایک عظیم سیلاب آ سکتا ہے' ـــــــ اور سب سے بڑھ کر مختلف احیائی تحریکوں کے پرجوش اور منظم کارکنوں کی مؤثر قوت بھی موجود ہے جسے صرف رخ کی تبدیلی کے ذریعے "فیصلہ کن" بنایا جا سکتا ہے! چنانچہ اس کے کچھ آثار نظر بھی آ رہے ہیں' اگرچہ ایک نئے خطرے کے ریڈ سگنل کے ساتھ! ـــــــ یعنی یہ کہ جمعیت علماءِ اسلام اور جماعتِ اسلامی دونوں کے معتبر اور مؤثر حلقوں میں انتخابی سیاست سے تو مایوسی اور بیزاری پیدا ہو رہی ہے ـــــــ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ انہیں واحد متبادل راستہ دنیا کے مروّجہ طریقوں کے مطابق صرف "کلاشنکوفی سیاست" کا نظر آ رہا ہے ـــــــ اللہ کرے کہ ہمارا یہ اندازہ غلط ہو' لیکن اگر خدانخواستہ یہ صورت پیدا ہو گئی تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہو گی اور احیاءِ اسلام کے مقصد کے اعتبار سے یہ راستہ شاید پہلی روش سے بھی بڑھ کر مضر اور نقصان دہ ثابت ہو۔ اور غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دینے سے شاید اِس پوری صدی کے دوران کی جانے والی احیائی مساعی ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں! ـــــــ بنا بریں ہمارے لئے واحد راہِ نجات اور لائحۂ عمل "منہجِ انقلابِ نبویؐ" ہے' چنانچہ اسلام میں عدلِ

اجتماعی کی اہمیت ' اسلامی انقلاب کی فکری اساس ' ——— اور انقلابِ محمدیؐ کے دعوتی اور تنظیمی اسالیب کے بعد اب ان شاء اللہ آئندہ صحبت میں "انقلابی تربیت کا نبویؐ طریق" کے موضوع پر گفتگو ہو گی!

KHALID TRADERS

IMPORTERS—INDENTORS—STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER—SMALL TO SUPER—LARGE

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

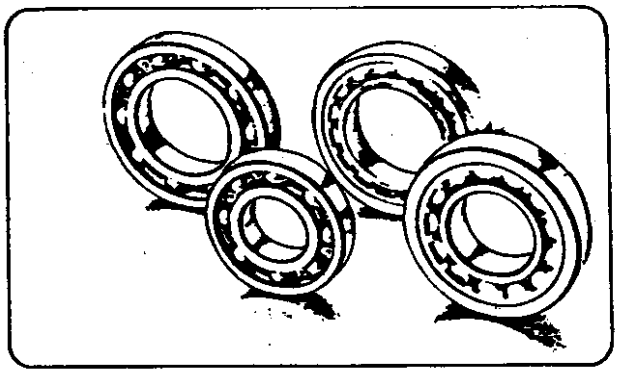

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

قندِ مکرّر

مولانا مودودی مرحوم اور میں

مولانا مودودی مرحوم کی وفات کے موقع پر آج سے دس سال قبل تحریر کردہ ایک نامکمل مضمون جو ستمبر اور اکتوبر ۸۲ء کے 'میثاق' میں دو اقساط کی صورت میں شائع ہوا ——— اور اس کے تکملہ کا ابتدائی حصّہ جو ۲۲ ستمبر ۹۲ء کو سپردِ قلم کیا گیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد

○

میرے پہلے سفر امریکہ کے بعض حالات و واقعات، اور
مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کی شدید خواہش، اور
ان کی نماز جنازہ میں شمولیت کی سعادت

○

مولانا مودودیؒ کے ساتھ
میرے تعلق کا ابتدائی دور

○

"یادِ یارِ مہرباں آید ہمے"
دس سال پیشتر تحریر کردہ مضمون 'مولانا مودودی مرحوم اور میں' کے تکملہ کا
ابتدائی حصہ جو ۲۲ر ستمبر ۹۲ء کو سپرد قلم کیا گیا

○

میرے پہلے سفر امریکہ کے بعض حالات و واقعات اور

مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کی شدید خواہش اور ان کی نمازِ جنازہ میں شمولیت کی سعادت

(شائع شدہ میثاق، ستمبر ۸۲ء بعنوان مولانا مودودی مرحوم اور میں)

یہ آج سے ٹھیک تین سال قبل کا ذکر ہے۔

اگست ۷۹ ۱۹ء کا وسط تھا اور رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ کا آخری عشرہ شروع ہونے والا تھا جب میرے پہلے سفرِ امریکہ کی تیاری مکمل ہوئی۔ اور امید واثق ہوئی کہ اگر کوئی نادیدہ رکاوٹ پیش نہ آگئی تو میں ہفتہ عشرہ میں بالٹی مور پہنچ جاؤں گا۔ اندریں حالات ایک روز اچانک ایک خیال ذہن میں بجلی کی طرح کوندا — آج کل مولانا مودودی بھی امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔ کاش کہ وہاں اُن سے ملاقات کی صورت نکل آئے!

اس وقت تک امریکہ کے جغرافیے کے بارے میں میری معلومات بس موٹی موٹی باتوں تک ہی محدود تھیں اور اُس کی ریاستوں اور شہروں کے محل وقوع کے بارے میں تفصیلی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں لہٰذا کچھ اندازہ نہ تھا کہ میرا امریکہ کے جن جن شہروں میں جانے کا پروگرام تھا، بفلو جہاں مولانا کا قیام تھا ان میں سے کسی کے آس پاس واقع ہے یا نہیں اور وہاں بآسانی جانا ممکن ہوگا یا نہیں، تاہم ایک خواہش تھی جو مسلسل زور پکڑتی چلی گئی یہاں تک کہ اُس نے 'ارادے' کی صورت اختیار کرلی کہ حتی الامکان اس سفر کے دوران مولانا سے ملاقات کی کوشش کرونگا — اس پر فطری طور پر بہت سی بھولی بسری باتیں بھی ذہن میں تازہ ہوئیں اور بہت سے سوئے ہوئے جذبات و احساسات بھی از سرِ نو بیدار ہوئے اور فی الجملہ قلب و ذہن پر اُس کیفیت کا تسلط سا ہوگیا جو اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ ؎

"ترکِ تعلقات بھی عین تعلقات ہے — آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ"

ان کیفیات میں جب کبھی یہ خیال آتا تھا کہ مولانا سے یہ ملاقات پورے سولہ سترہ سال بعد ہو گی تو ایک عجیب سی حسرت آمیز مسرت کا احساس ہوتا تھا جس کی تعبیر الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے پورے سترہ سال ملاقات کیوں نہ کی — بلکہ پورے بارہ سال سے ایک ہی شہر میں زیادہ سے زیادہ تین چار میل کے فاصلے پر مقیم ہوتے ہوئے بھی ملاقات کا خیال کیوں نہ آیا — اور اب اچانک کرۂ ارضی کے بالکل دوسری جانب دیارِ غیر میں ملاقات کا اشتیاق اسقدر شدت سے کیوں پیدا ہوا؟ — تو اصل میں اسی سوال کا جواب ہے جو اس تحریر کے ذریعے دیا جانا مقصود ہے۔ اگرچہ اس کے لئے قارئین کو ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔

لاہور سے ہفتہ ۱۸ اگست ۹۰ء کی شام اور کراچی سے ۱۹ اگست کو علی الصبح ڈیڑھ بجے روانہ ہو کر میں اسی تاریخ کی رات کو ساڑھے نو بجے امریکہ میں اپنے پہلے مقام، بالٹی مور جا پہنچا۔ اس سفر کے بعض نہایت دلچسپ واقعات میں ایک روداد سفر کی صورت میں تحریر کر چکا ہوں جو "میثاق" کے جنوری۔ فروری ۹۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بہرحال بالٹی مور میں میں نے اپنے میزبانوں سے اوّلین معلومات جو حاصل کیں وہ بغلو ہی کے بارے میں تھیں اور میرے دل کی کلی ایک دم کھل اٹھی اور اُمیدوں کے چراغ دفعتہً روشن ہو گئے جب مجھے معلوم ہوا کہ بغلو ٹورنٹو سے جہاں مجھے اپنے اس سفر کے دوران سب سے طویل قیام کرنا تھا صرف سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں سے بغلو آنا جانا بآسانی ایک دن میں ہو سکتا ہے۔

یکم ستمبر ۹۰ء تک بالٹی مور واشنگٹن ایریا میں قیام کے بعد، دو دن ڈلاس میں اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کی سالانہ کنونشن کے نذر کر کے ۳ ستمبر

کو ٹورنٹو پہنچا تو وہاں بھی اوّلین معلومات مولانا ہی کے بارے میں حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ اُن کی طبیعت ناساز ہے۔ تاہم مقامی 'حلقہ احبابِ اسلامی'[1] کے رفقاء کا مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق سے مسلسل رابطہ قائم ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی ملاقات کی صورت پیدا کر لی جائے گی ـــــ ایک دو روز بعد معلوم ہوا کہ مولانا کی انتڑیوں کی تکلیف بڑھ گئی تھی جس کے باعث ایک بڑا اپریشن کرنا پڑا اور اب اُن سے ملاقات لگ بھگ دو ہفتے کے بعد ہی ممکن ہوگی۔ اس سے فوری طور پر تو اُمید کے چراغ کچھ بجھتے سے محسوس ہوئے لیکن ساتھ ہی اللہ کا شکر بھی قلب کی گہرائیوں سے اُبھرا کہ ٹورنٹو میں میرے قیام کا پروگرام پہلے ہی سے دو ہفتے سے زائد طے تھا ـــــ البتہ ایک دوسری چیز جس کا ذکر بار بار سننے میں آ رہا تھا کسی قدر تشویش کی موجب بن رہی تھی اور وہ یہ کہ حلقہ احباب کے اکثر ارکان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر احمد فاروق بہت سخت مزاج بلکہ بدتمیز قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں یہ تو بالکل ہی پسند نہیں ہے۔ کہ کوئی ان کے والد سے ملاقات کے لئے آئے، فون پر بھی ان کا انداز بہت روکھا پھیکا بلکہ درشت اور خشونت آمیز ہوتا ہے ـــــ خود مجھے مولانا کے صاحبزادگان اور ان کے مزاج سے قطعاً کوئی واقفیت نہ تھی۔ جماعتِ اسلامی کے مرکز واقع ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں جہاں مولانا بھی اپنے اہل وعیال سمیت مقیم تھے میری آمد و رفت زیادہ تر ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک رہی تھی اور اُس وقت تک مولانا کے تمام صاحبزادے بہت چھوٹے تھے چنانچہ میں ان میں سے نام بھی صرف سب سے بڑے کا جانتا تھا یعنی سیّد عمر فاروق مودودی کا۔ ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کا نام پہلی بار اُس وقت سننے اور پڑھنے میں آیا تھا جب مولانا چند سال قبل بغرض علاج لندن اور امریکہ گئے تھے۔ باقی اُن سے کوئی اور واقفیت قطعاً نہ تھی۔ ـــــ بہرحال اس قسم کی باتوں سے دل ڈوبتا سا محسوس ہوا کہ اگر حلقہ احباب

---

[1] جماعتِ اسلامی کے وابستگان اور متاثرین نے معلوم کن مصلحتوں کی بنا پر امریکہ میں اپنے آپ کو جماعت کے نام سے منظم کرنے کی بجائے "حلقہ احبابِ اسلامی" کے نام سے صرف ایک ڈھیلے ڈھالے حلقہ احباب کی صورت دے رکھی ہے!

اسلامی، کے ارکان کے ساتھ مولانا کے صاحبزادے کا رویّہ بہ ہے تو دو تا بہ من چہ می رسد ؟" ـــــ تاہم ارادہ بہرحال یہی رہا کہ "ہر چہ بادا باد!" ملاقات کی کوشش ضرور کرونگا ـ

اسی اثناء میں ایک روز میں ٹورنٹو کی بوسٹیڈ روڈ کی جامع مسجد میں بعد نماز مغرب قرآن مجید کا درس دے رہا تھا کہ ایک صاحب نے ایک رقعہ تھمایا جس میں تحریر تھا کہ مولانا مودودی پر عارضۂ قلب کا حملہ ہوا ہے ان کے لئے دُعائے صحت کرا دیجئے! اس خبر سے خود میرے اعصاب پر شدید صدمے کا حملہ ہوا اور میں چند لحظے تو گم سُم اور بھونچکا سا رہا ـ بعد میں اپنے حواس کو مجتمع کر کے میں نے حاضرین کو اس کی اطلاع بھی دی اور اجتماعی دعا بھی کی ـــــ تاہم پہلی بار مجھے کچھ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے منزل عین نگاہوں کے سامنے آنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہو اور میرے ساتھ "تدبیر کند بندہ ـ تقدیر کند خندہ" والا معاملہ ہو رہا ہو ـ

قیام ٹورنٹو کے دن پورے ہو گئے لیکن بفلو سے ملاقات کی اجازت موصول نہ ہوئی تو دل ڈوبنے سا لگا لیکن دفعتہً پھر اُمید کی ایک کرن نمودار ہوئی اس لئے کہ ٹورنٹو میں میرے میزبان سمیع اللہ خان صاحب نے مانٹریال کے بعض احباب کے اصرار کی بنا پر وہاں کے سفر کا پروگرام بنا لیا ـ یہ سفر کار کے ذریعے ہوا اور اس میں تین دن صرف ہو گئے ـــــ واپس آئے تو تازہ ترین اطلاع یہ ملی کہ اب مولانا کی طبیعت بہت حد تک بحال ہو چکی ہے اور ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ دو تین روز کے بعد ملاقات کی اجازت مل جائے گی ـــــ ادھر بعض احباب کی تحریک پر میری ایک وزٹ (ISIT IA) شکاگو کی طے ہو گئی تھی اور ریزرویشن اس طرح ہوئی تھی کہ ٹورنٹو سے شکاگو جانا ہوگا اور وہاں سے براہِ راست نیویارک جہاں سے واپسی کا سفر شروع ہو جانا تھا ـ میری خواہش پر احباب نے پورا پروگرام تبدیل کیا اور اب طے پایا کہ میں شکاگو میں دو تین دن قیام کر کے واپس ٹورنٹو آؤں اور یہاں سے بفلو جا کر احباب کی معیت میں مولانا سے ملاقات

کروں اور پھر ٹورنٹو سے نیویارک روانہ ہوں ـــــ ٹورنٹو کے احباب کے میری خوشنودی کی خاطر اتنے اہتمام پر (جس پر یقیناً پیسے کا صَرف بھی بڑھ رہا تھا) ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جمعہ ۲۱ ستمبر کی سہ پہر کو میں شکاگو روانہ ہوا۔

شکاگو کا ذکر تو اس سے قبل بہت سننے پڑھنے میں آیا تھا، اور اکثر و بیشتر کسی اچھی بات کے ضمن میں نہیں بلکہ کسی نہ کسی بُرائی ہی کے سلسلہ میں آیا تھا۔ تاہم وہاں کسی سے کوئی ذاتی شناسائی نہ تھی۔ ٹورنٹو میں جو احباب میرے درس میں تسلسل اور پابندی کے ساتھ شریک رہے تھے ان میں سے ایک صاحب نے خود ہی خفیہ خفیہ اپنے ایک عزیز ڈاکٹر خورشید احمد ملک صاحب کو میری آمد کی اطلاع دے کر اُن سے 'دعوت' منگوا لی تھی اور اب میں صرف اُن کے نام کی واقفیت کے ساتھ شکاگو جا رہا تھا ـــــ شکاگو کی 'اوہیئر' ایئرپورٹ پر جو صاحب لینے آئے وہ ڈاکٹر خورشید ملک نہیں بلکہ ڈاکٹر وصی اللہ خاں تھے ـــــ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خورشید چونکہ خود کسی آپریشن کے سلسلے میں مصروف تھے لہٰذا انہوں نے انہیں میرے استقبال پر مامور کیا ہے۔ جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ یہ وہی ڈاکٹر وصی اللہ ہیں جن کا ذکر لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے ضمن میں جماعت و جمعیت کے حلقوں میں سننے میں آتا رہا تھا ـــــ بلکہ مزید انکشاف یہ بھی ہوا کہ ہم آپس میں دور نزدیک کی قرابت بھی رکھتے ہیں ـــــ یعنی ان کی والدہ صاحبہ اور میری والدہ ماجدہ دونوں ایک ہی خاندان سے ہیں ـــــ بہرحال ڈاکٹر وصی اللہ خان نے مجھے تیس چالیس میل کا سفر اپنی کار پر طے کرا کے ڈاکٹر خورشید صاحب کے مکان واقع ڈاؤنرز گروو پر پہنچایا ـــــ اور مجھے وہاں 'ڈراپ' کر کے وہ خود بھی فوراً اپنی کسی مصروفیت کا عذر کر کے روانہ ہو گئے ـــــ اب میں تھا اور ایک خالص اجنبی ماحول لیکن جلد ہی یہ سارے حجابات دُور ہو گئے، ڈاکٹر خورشید صاحب کی والدہ صاحبہ نے جس شفقت و محبت کا اظہار کیا اور ان کے وجود کے روئیں روئیں سے جس سادگی اور اخلاص کی مہک آئی اُس نے فوراً ہی ایسے محسوس کرا دیا کہ گویا میں اپنے ہی گھر میں اپنی ہی حقیقی والدہ کے زیرِ سایہ ہوں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر خورشید صاحب

بھی آ گئے - تو اندازہ ہوا کہ "الولدُ سِرٌ لابیہٖ" کے حق ہونے میں تو غالباً سب ہی کو اتفاق ہے لیکن یہاں اصل معاملہ "الولدُ سِرٌّ لوالدتہٖ" کا ہے، — نہایت کھلے مزاج کے حامل اور خلوص و اخلاص کے پیکرِ کامل ! — مجھے اس وقت کچھ اندازہ نہ تھا کہ آئندہ میرے سالانہ سفرِ امریکہ کا اصل باعث اسی شخص کو بننا ہے اور امریکہ سے کل کا کل تعلق ان ہی کے واسطے سے ہوگا -

بہرحال بعد نمازِ مغرب ان کے مکان پر درسِ قرآن کی نشست ہوئی جس کے کل شرکاء نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے —— اور اکثر طب کے پیشے سے منسلک تھے -

اگلے روز یعنی ہفتہ ۲۲ ستمبر کی صبح کو ڈاکٹر صاحب تو پھر اپنی معالجاتی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے گھر سے نکل گئے - مجھے ایسے ہی خیال آیا کہ صدر ایوب خاں مرحوم کے دَور کی ایک 'بدنام' علمی شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے بارے میں سُنا تھا کہ شکاگو میں مقیم ہیں - ڈاکٹر خورشید صاحب کے اہلِ خانہ سے اُن کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ قیام تو ان کا زیادہ دُور نہیں ہے (یعنی یہی کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر ہے!) لیکن وہ کسی سے کم ہی ملتے جلتے ہیں لہٰذا ملاقات آسان نہیں ہے — میں نے توکلاً علی اللہ ان کو فون کر دیا تو حیرت ہوئی کہ وہ فوراً ہی خود آنے کے لئے تیار ہو گئے اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر کرتے پاجامے ہی میں تشریف لائے - میں اُن کے بعض نظریات سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود اُن کی سادگی اور علمی خلوص کا پہلے سے معترف تھا اور ۱۹۶۰ء میں جو ہنگامہ اُن کے خلاف پاکستان کے مذہبی حلقوں کی جانب سے ہوا تھا اُس میں میں نے اُن کی جانب سے کچھ تھوڑی سی 'مدافعت' بھی کی تھی (جس پر مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے مجھے اپنے مجلّے 'المنبر' میں "ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نئے وکیل ، ڈاکٹر اسرار احمد" کے خطاب سے نوازا تھا!) غالباً اُسی کا اثر تھا کہ کامل گوشہ گیری اور ملنے جُلنے سے احتراز کے باوجود ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے اس طرح بلا تامّل و تکلّف چلے آئے -

بہرحال ابھی اُن سے گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر خورشید صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور انہوں نے یہ رُوح فرسا خبر سنائی کہ مولانا مودودی کا انتقال ہو گیا

ہے، مجھے معاً یہ خیال آیا کہ ٹورنٹو میں مولانا کی طبیعت کی بحالی کی جو خبر ملی تھی وہ دراصل اُن کا آخری سنبھالا، تھا جیسے بجھنے والا چراغ آخری بار ذرا دیر کے لئے بھڑک اٹھتا ہے ـــــ میرے اعصاب پر اس خبر سے بجلی سی گری اور میں گم سم سا ہو گیا - ڈاکٹر خورشید نے میرے احساسات اور جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً سوال کر دیا "کیا آپ مولانا کے جنازے میں شرکت کرنا چاہیں گے!" جس پر میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے "کیا یہ ممکن ہے؟" ـــــ اس کا کوئی جواب تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے نہ دیا البتہ فوراً ٹیلی فون کی جانب متوجہ ہو گئے اور چند ہی منٹوں میں مژدہ سُنایا: "فوراً تیار ہو جائیں، حلقہ احباب اسلامی کا ایک قافلہ فی الفور بفلو کے لئے روانہ ہو رہا ہے اور آپ کے لئے بھی اُن کے ساتھ ہی بکنگ ہو گئی ہے"۔ چنانچہ نہایت عجلت میں ایئر پورٹ کے لئے روانگی ہوئی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بھی اسی کُرتے پاجامے میں میرے ساتھ ہی ایئر پورٹ تک گئے (حالانکہ امریکی تہذیب کے اعتبار سے یہ بہت گری ہوئی حرکت ہے - وہاں صرف ایک نیکر اور بنیان پہن کر تو انسان پورا "ملبس" شمار ہوتا ہے - لیکن کُرتے پاجامے والا انسان 'ننگا' قرار پاتا ہے!) راستے میں وہ مولانا کے ساتھ اپنی جوانی کے دَور کے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے رہے اور نظریات میں شدید اختلافات کے باوجود مولانا کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے رہے - ایئر پورٹ پر آٹھ دس حضرات کا قافلہ موجود تھا جن میں سے کسی سے کوئی ذاتی تعارف نہ تھا، صرف بعض حضرات رات کے درس میں شریک رہے تھے ـــــ البتہ اچانک برادرم ظفر الحق انصاری نظر آئے تو محسوس ہوا کہ یہ شعر عام حالات میں تو شاید مبالغے ہی پر مبنی نظر آئے گا لیکن 'دیارِ غیر' کی حد تک بالکل مبنی بر حقیقت ہے کہ اے دوست! کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا - بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے!" ـــــ بہر حال بفلو ایئر پورٹ سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ راستہ وغیرہ کسی کو معلوم نہیں - فون پر ڈاکٹر احمد فاروق سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے - نماز جنازہ ہو چکی ہے - اور "فیونرل ہوم" (FUNERAL HOME) والے مولانا کی

میت کو لینے کے لئے بس آنے ہی والے ہیں - اس اطلاع سے سب پہ سراسیمگی سی طاری ہوگئی - کیا بفلو پہنچنے کے باوجود نہ مولانا کی نماز جنازہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوگی - نہ اُن کا منہ دیکھنا ہی نصیب ہوگا ؟ —— لیکن ڈاکٹر احمد فاروق صاحب کے گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ الحمدللہ ابھی مولانا کی میت وہیں موجود ہے —— حالانکہ ہمیں گھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے میں خاصی تاخیر بھی ہوگئی تھی -

میرے دل کی اس وقت جو کیفیت تھی وہ بیان سے باہر ہے - ایک جانب شدید رنج و صدمہ اور خاص طور پہ یہ حسرت کہ مولانا سے اُن کی زندگی میں ملاقات نہ ہوسکی اور جو خواہش اس قدر اچانک اور اتنی شدت سے پیدا ہوئی تھی وہ تشنۂ تکمیل رہ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ ؎ "قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند - دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا !" دوسری جانب خود مولانا کے بارے میں یہ حسرت آمیز احساس کہ "مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور !" —— یہاں امریکہ میں کتنے لوگوں کو احساس ہوگا کہ آج کون دُنیا سے اُٹھ گیا - یہ حادثہ اگر لاہور میں پیش آیا ہوتا تو جو کہرام پورے شہر میں مچا ہوتا اُسے چشمِ تصوّر کے سامنے رکھتے ہوئے جب میں نے ڈاکٹر احمد فاروق کے مکان پر مجمع گنتی کے چند اشخاص کو دیکھا تو دل میں درد کی ایک شدید ٹیس محسوس ہوئی ، تیسری جانب خود اپنے بارے میں ایک انجانا سا خوف تھا کہ معلوم یہاں میرا استقبال کس طرح ہو - ذہناً میں اس کے لئے بھی پوری طرح تیار ہو کر گیا تھا کہ ڈاکٹر احمد فاروق نہایت درشتی کے ساتھ کہہ دیں کہ "آپ اب یہاں کیا لینے آئے ہیں ؟ گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں !" اور یوں میں باہر ہی سے بصد حسرت و یاس لوٹا دیا جاؤں !

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر احمد فاروق نے میرا استقبال نہایت شریفانہ و مہذّبانہ انداز ہی میں نہیں حد درجہ ادب و احترام کے ساتھ کیا اور چھوٹتے ہی یہ الفاظ کہے -

"میں نے آپ کا سلام ابّا جان کو پہنچا دیا تھا —— اور یہ بھی کہ آپ ملاقات کے خواہشمند ہیں - اُدھر ابّا جان بھی آپ سے

ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن ڈاکٹروں نے شدید پابندی لگائی ہوئی تھی کہ نہایت قریبی اعزّہ کے سوا اور کوئی ملاقات نہ کرے!"

میرے حواس نیم گم سُم تو پہلے ہی سے تھے، ڈاکٹر احمد فاروق کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں بالکل ہی گم سُم ہو کر رہ گیا۔ جس پر خود انہوں نے مجھے مکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ان کے ڈرائنگ رُوم میں ایک بنچ پر مولانا کا جسدِ خاکی سفید براق کفن میں لپٹا رکھا تھا۔ بصد حسرت و یاس اُن کا دیدار کیا اور پھر نمازِ جنازہ کے لئے صف درست کی، سب لوگوں نے باصرار مجھے ہی امامت کے لئے آگے بڑھایا۔ جو لوگ اس سے قبل نماز ادا کر چکے تھے وہ بھی دوبارہ شریک ہو گئے لیکن اس پر بھی کل تعداد پندرہ بیس کی ہو گی۔ (اس وقت جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ اس سے قبل صرف ایک بار نمازِ جنازہ ہوئی ہے۔ بعد میں روزنامہ 'جسارت'، کراچی میں شائع شدہ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل دو بار نمازِ جنازہ ادا کی جا چکی تھی اور میری امامت میں جو نماز ہوئی وہ تیسری تھی۔ واللہ اعلم!) —— نماز سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ شور مچ گیا کہ فیونرل ہوم والے آ گئے ہیں اور جلدی کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ امریکی قانون کے مطابق میّت گھر پر لانے کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ ہسپتال سے لاش سیدھی فیونرل ہوم یعنی "جنازہ گاہ" جاتی ہے اور وہیں غسل اور تجہیز و تکفین ہوتی ہے اور جملہ رسومات ادا کی جاتی ہیں یہ تو چونکہ احمد فاروق خود ڈاکٹر تھے —— اور ایک عرصے سے بفلو میں مقیم ہونے کے باعث کافی بااثر بھی تھے لہٰذا مولانا کی میّت گھر پر آ سکی اور تجہیز و تکفین کے مراحل مولانا کی اہلیہ صاحبہ کی نگرانی میں پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ طے پا سکے۔ —— یہ بات پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ 'فیونرل ہوم' والوں کو کسی سبب سے دیر ہو گئی تھی تب ہی ہم مولانا کی زیارت بھی کر سکے اور نمازِ جنازہ بھی ادا کر سکے ورنہ اگر وہ اپنے متعین وقت پر آ جاتے تو ہم ان سعادتوں سے بھی محروم ہی رہتے —— جیسے کہ ڈاکٹر انیس احمد برادرِ خورد پروفیسر خورشید احمد محروم رہے اس لئے کہ وہ اپنے

چند ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پہنچے جب مولانا کی میت روانہ ہو چکی تھی) ــــــ بہرحال ڈرائنگ رُوم سے باہر فیونرل ہوم کی گاڑی تک لانے میں جو مختصر فاصلہ طے ہوا اُس میں مولانا کی میت کو کندھا دینے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی ــــــ

اس موقع پر دو باتیں بہت اچھی مشاہدے میں آئیں : ایک یہ کہ ڈاکٹر احمد فاروق لوگوں کو مولانا کی تصویر اتارنے سے شدّت سے روک رہے تھے بلکہ ایک موقع پر ذرا سی دیر کو وہ اندر گئے تو ایک نوجوان نے جلدی سے اپنے کیمرے کا بٹن دبا دیا اور تصویر اتار لی - لیکن ڈاکٹر احمد فاروق واپس آئے تو انہیں کسی طرح اس کا اندازہ ہو گیا - چنانچہ انہوں نے باصرار اُن صاحب کے کیمرے سے فلم نکلوالی اور یہ الفاظ کہے کہ "میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ ان تصویروں کا کیا کریں گے!" اس سے مجھے کسی قدر اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر احمد فاروق کی مبیّنہ سخت مزاجی بلکہ 'بدتمیزی' کی اصل حقیقت کیا ہے! ــــــ دوسرے اس بحث کے ضمن میں کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو مولانا کی اہلیہ صاحبہ کی یہ رائے سامنے آئی کہ ہماری تو خواہش ہے کہ مولانا کی تدفین مدینہ منورہ میں جنّت البقیع میں ہو ــــــ لیکن اس ضمن میں آخری فیصلہ میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی کا ہو گا اور اگر وہ ہماری رائے سے اتفاق کریں تو سعودی عرب کی حکومت سے اس ضمن میں گفت و شنید بھی وہ خود ہی کریں!"

اُسی رات کی آخری فلائٹ سے جب ہم لوگ بھاری سے دل اور خالی سے ہاتھ لئے بفلو سے واپس شکاگو جا رہے تھے تو جو کیفیات ہم سب پر طاری تھیں ان کا اندازہ ہر شخص بخوبی لگا سکتا ہے - ان کیفیات کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک تو یہ سوال بار بار آ رہا تھا کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو گی ؟ ــــــ یہ تو مجھے یقین تھا کہ جماعتِ اسلامی پاکستان مولانا کی میت کو لازماً پاکستان ہی لے کر جائے گی - پاکستان میں میرا گمان تھا کہ اوّلاً تو کراچی کے احباب شدّت کے ساتھ چاہیں گے کہ مولانا کی تدفین وہیں ہو - پورے پاکستان میں جماعتِ اسلامی کی مضبوط ترین

تنظیم بھی کراچی ہی میں ہے اور اُس کا سب سے زیادہ گہرا سیاسی اثر و رسوخ بھی وہیں ہے، کتنی ہی بار کراچی والوں نے چاہا تھا کہ جماعت کا مرکز کراچی منتقل ہو جائے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ میرا گمان تھا کہ اب آخری بار جماعت کراچی کی جانب سے ضرور کوشش ہوگی کہ مولانا کی آخری آرام گاہ تو وہاں بن ہی جائے ___ لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ ایسا ہو نہیں سکے گا اور میت لامحالہ لاہور جائے گی ___ اور وہاں کے حالات کے بارے میں اِدھر اُدھر سے جو معلومات وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی رہی تھیں اُن کی بنا پر اندیشہ تھا کہ مولانا کے پس ماندگان اور جماعت اسلامی کی قیادت کے مابین لازماً رسّہ کشی ہو گی۔ جماعت کے ذمہ دار حضرات چاہیں گے کہ مولانا کی تدفین 'منصورہ' میں ہو اور یہ مولانا کے صاحبزادوں کو کسی طور گوارا نہ ہو گا ___ بالآخر ہو گا کیا؟ اس کا جواب تو میرے پاس نہ تھا البتہ دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ یا تو مولانا کی تدفین مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کے عام قبرستان میں ہو ___ یا اگر کوئی نمایاں جگہ مطلوب ہی ہو تو کاش کہ مولانا کو بادشاہی مسجد کے سامنے علامہ اقبال مرحوم کے پہلو میں جگہ مل جائے۔ اس میں جہاں ان دونوں زعماء کی فکری اور نظریاتی ہم آہنگی پیشِ نظر تھی وہاں یہ واقعہ بھی مدّنظر تھا کہ مولانا کو حیدر آباد دکن سے جانب پنجاب ہجرت کی دعوت دینے والے علامہ اقبال مرحوم ہی تھے!! ۔ میرے ذہن کی یہ ساری ادھیڑبن اپنی جگہ پر، لیکن چند روز بعد نیو یارک میں مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہ سے اور پھر لاہور واپسی پر اخبارات وغیرہ کے ذریعے جو حالات معلوم ہوئے ان کا واقعہ یہ ہے کہ کوئی سان گمان بھی مجھے اس وقت نہ تھا۔ نیو یارک اور لندن کے ہوائی اڈوں پر ڈاکٹر احمد فاروق اور پروفیسر خورشید صاحب کے مابین تلخ کلامی، جماعت کی جانب سے کراچی کے کسی الیکشن کے پیش نظر میت کے پاکستان پہنچنے کے پروگرام میں تاخیر کی کوشش پر ڈاکٹر احمد فاروق کا غصہ اور پیچ و تاب، پھر لاہور میں تدفین کی جگہ کے فیصلے پر جماعتِ اسلامی کی قیادت اور مولانا کے پس ماندگان کے مابین شدید کشمکش بلکہ محاذ آرائی اور باہمی تو تکار تک نوبت، اور بالآخر

مولانا محمد یوسف (امیر جماعتِ اسلامی ہند) کی کوششوں سے تصفیہ — اور تدفین کے بعد مولانا کے چھ صاحبزادوں کی مشترکہ پریس کانفرنس جس میں انہوں نے جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار لوگوں پر شدید الزامات عائد کئے وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی مجھے اس وقت نہ تھا۔

بفلو سے شکاگو واپسی کے سفر میں میٹرک کے زمانے میں پڑھی ہوئی ایک انگریزی نظم "نغمۂ زندگی" (PSALM OF LIFE) میری یادداشت کے زیریں حصّے سے رفتہ رفتہ اُبھر کر ذہن کی سطح پر تیرنے لگی۔ میں اس نظم کا ایک بند سورۃ العصر کے درس میں لفظ 'عصر' کی تشریح کے ضمن میں اُردو کے اس شعر کے ساتھ ساتھ کہ

"غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی — گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی!"

پڑھا کرتا تھا — یعنی

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave

Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

لہٰذا اس نظم کا یہ بند تو مجھے یاد تھا لیکن باقی نظم قطعاً یاد نہ تھی۔ اور بعض مواقع پر میں نے حافظے پر زور دے کر یاد کرنا چاہا تو بھی یاد نہ کر سکا تھا۔ لیکن اس وقت جو کیفیت قلب و ذہن پر طاری تھی اس کے زیرِ اثر وہ پوری نظم از خود میری یادداشت کی گہرائیوں سے ابھر آئی اور پورے سفر کے دوران میرے ذہن پر چھائی رہی!

Tell me not in mournful numbers,
Life is but an empty dream.
For the soul is dead that slumbers,
And things are not what they seem

Life is real, life is earnest,
And the death is not its goal,
"Dust thou art, to dust returnest "
Was not spoken of the soul

اس کے بعد وہ بند ہے جو اوپر نقل ہوا ——— اور پھر :

Let us then be up and doing,
With a heart for any fate,
Still acheiving, still pursuing,
Learn to labour and to wait.

Lives of great men all remind us,
We can make our lives sublime,
And departing leave behind us,
Footprints on the sands of time.
Footprints, that perhaps another,
Sailing over life's solemn main,
A ship-wrecked and forlorn brother
Seeing may take heart again

الغرض ان احساسات اور کیفیات کے ساتھ بفلو سے شکاگو واپسی ہوئی۔ وہاں ۲۳ر اور ۲۴ر کے دو دنوں کے دوران کچھ مفصل ملاقاتوں اور کچھ درسِ قرآن کی محفلوں کے بعد ۲۵ر کو ٹورنٹو واپس آنا ہوا۔ اگرچہ اب اس مراجعتِ ٹورنٹو کا اصل مقصد فوت ہو چکا تھا۔ تاہم چونکہ پروگرام اسی طرح بنا تھا اور میرا سامان وہیں رکھا تھا۔ لہٰذا وہاں جانا ضروری تھا۔ وہاں سے ۲۷ر کو نیویارک واپسی ہوئی جہاں مولانا یوسف اصلاحی (رام پور۔ انڈیا) کی زبانی معلوم ہوا کہ شدید ردّ و قدح اور تلخی و محاذ آرائی کے بعد بالآخر مولانا کی تدفین اُن کے مکان واقع ۵ ۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور ہی کے بیرونی پلاٹ میں ہوئی جہاں وہ کم و بیش تیس سال تک عصر اور مغرب کی نمازیں باجماعت ادا کرتے رہے تھے ——— اس پر ایک عجیب سا خیال ذہن میں آیا کہ اچھرہ بھی عجیب بستی ہے، اس میں بین فیروز پور روڈ کی ایک جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے پر علّامہ عنایت اللہ المشرقی مدفون ہیں جتنے فاصلہ پر سڑک کی دوسری جانب اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قبر ہے اور ذرا آگے چلیئے تو سڑک کی ایک جانب شاہ جمال رح کا مزار ہے تو دوسری جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے پر شاہ کمال رح کا ——— اگلے روز مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہٗ سے ملاقات کے دوران وہ حالات و واقعات علم میں آتے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تو میں نے

خود اپنے آپ میں ایک ندامت سی محسوس کی، معلوم کیوں!

نومبر کے پہلے ہفتے میں لاہور واپس پہنچ کر فوری اور ضروری امور سے فراغت کے فوراً بعد پہلی فرصت میں ۵ - اے ذیلدار پارک اچھرہ حاضری ہوئی - ڈاکٹر احمد فاروق واپس امریکہ جاچکے تھے - مولانا مرحوم کے باقی پانچ صاحبزادوں سے اجتماعی ملاقات، ہوئی جو بحمداللہ ہرگز "رسمی" نہ تھی - نماز مغرب کا وقت آیا تو سب نے باصرار مجھے ہی آگے بڑھایا - یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ مولانا کی قبر نہایت سادہ تھی اور اس کی نہ تو سطح ہی زمین سے زیادہ بلند تھی نہ ہی کسی اور تکلف یا تصنع کے کوئی آثار تھے ــــ بہرحال مرقدِ سید پر سلام و دعا کے ساتھ دل ہی دل میں یہ شعر پڑھتے ہوئے واپسی ہوئی ؎

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔۔۔ سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!"

مولانا مودودی مرحوم کے دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی نے بفلو میں جس انداز میں میرا استقبال کیا تھا اُس کے ضمن میں احسان مندی کا گہرا نقش میرے دل پر قائم تھا - اور خیال یہ تھا کہ لاہور میں ان سے ملاقات ہوگی تو اُن کے شکریے کا جو قرض میرے ذمہ واجب الادا ہے ان کی خدمت میں پیش کروں گا ــــ مزید برآں انہوں نے جو یہ الفاظ کہے تھے کہ "اباجان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے!" تو اس وقت تو رنج و غم کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں قلبی مسرت کی ایک بجلی سی ان کے ذریعے کوند گئی تھی لیکن بعد میں ان کے ضمن میں یہ احساس رہا کہ "آنچہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب؟" لہٰذا اُن کی بھی توثیق کی خواہش دل میں تھی چنانچہ اگلے سال جب پھر امریکہ اور کینیڈا کا سفر ہوا تو ۳ ستمبر ۸۰ء کو میں ٹورنٹو کے دو احباب سمیع اللہ خاں اور محمد نجم طاہر کی معیت میں بفلو حاضر ہوا - اور میری حیرانی اور احسانمندی میں مزید اضافہ ہوا کہ اس بار میرا استقبال اور بھی زیادہ گرم جوشی سے ہوا - دن کا کھانا

بھی میں نے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی ہی کے ساتھ کھایا جنہوں نے میری خاطر ہسپتال سے نصف یوم کی رخصت لے لی تھی - اس موقع پر ایک تو میں نے اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور صاف بتا دیا کہ "میں تو گذشتہ سال ذہناً اس کے لئے بھی تیار ہو کر آیا تھا کہ آپ مجھے گھر میں داخل ہونے سے روک دیں لیکن جو پذیرائی آپ نے میری اس موقع پر کی اُس کے لئے حسبِ فرمان نبویؐ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ!" جو شکریہ میرے ذمے تھا اُس وقت تو میں اسے شدتِ جذبات سے مغلوبیت کے باعث ادا نہ کر سکا تھا۔ اب یہ پورا سفر اُسی قرض کی ادائیگی کے لئے کیا ہے ——— ثانیاً میں نے احبابِ ٹورنٹو کی موجودگی میں اُن سے اُن متذکرہ بالا الفاظ کی توثیق حاصل کی جواب میرے لئے سرمایۂ صد افتخار ہیں - ثالثاً تحریکِ اسلامی اور اس کے مستقبل کے بارے میں مفصّل گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ مولانا کے صاحبزادگان میں سے کم از کم ڈاکٹر احمد فاروق بھرپور تحریکی مزاج کے حامل ہیں - لیکن بعض طالع آزما لیڈروں نے جو معاملہ اُن کے ساتھ کیا اور اوّلاً ان کے قیامِ کراچی اور وابستگیٔ جمعیت کے دوران اور پھر امریکہ میں ان کی کردار کشی کی جو مہم چلائی اُس نے اُن کے مزاج میں زہر کی تلخی بھی گھول دی ہے اور مایوسی کی تاریکی بھی!! ——— ورنہ وہ اعلیٰ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی فہم، تحریکی شعور اور پابندیٔ صوم وصلوٰۃ ہر اعتبار سے نہایت قیمتی آدمی ہیں - میں نے ہر چند انہیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ پاکستان مراجعت اختیار کریں اور اپنے والدِ مرحوم کے مشن کو خود اپنے فہم وشعور کے مطابق جاری رکھنے کے لئے اپنے دوسرے بھائیوں کے تعاون سے آگے قدم بڑھائیں لیکن محسوس یہی ہوا کہ انہیں بعض مشہور ومعروف حضرات سے بالکل آمنے سامنے کے تصادم (CONFRONTATION) کا شدید اندیشہ ہے جس کے باعث وہ عافیت پاکستان سے دُور رہنے ہی میں محسوس کرتے ہیں - بہرحال جو کچھ اُس روز اُن سے سننے میں آیا اُس کو جوں کا توں نقل کرنا نہ تا حال زبان کے لئے ممکن ہے نہ قلم کے لئے ——— گویا ؎ "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز!" والا

معاملہ ہے ۔ تاہم اسقدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگرچہ میں جماعت اسلامی کے ناقدین میں غالباً اب بعض دوسرے بزرگوں کی مصلحت آمیز خاموشی کے باعث) سرِفہرست ہوں اور اس کوچے کا بدنام ترین فرد سمجھا جاتا ہوں لیکن بایں رسوائی و بدنامی اُن باتوں کے عشرِ عشیر کا علم تو در کنار رسان گمان تک نہیں رکھتا تھا جو اُس روز ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے ذریعے میرے علم میں آئیں ـــــ اور جن کا ماحصل علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ ؎

"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری"!

ـــــ ویسے حال ہی میں جو مقدّمہ بازی (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے متعدد مرکزی رہنماؤں اور مولانا مرحوم کے چوتھے صاحبزادے حسین فاروق مودودی کے مابین شروع ہوئی ہے اور جس نوع کے بیانات مولانا کے پانچویں صاحبزادے حیدر فاروق مودودی کی جانب سے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت اب زیادہ دُور نہیں کہ

ع "سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا !"

میرے لئے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کی ملاقات اور گفتگو سے حاصل شدہ معلومات کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ اُن جملہ اطلاعات کی توثیق ہو گئی جو مجھ تک اِدھر اُدھر سے پہنچتی رہی تھیں اور جن کے باعث دل میں شدید تمنا پیدا ہوئی تھی کہ امریکہ میں مولانا سے ملاقات کی جائے، (اُن کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا !)

بہر حال ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے جو ذہنی و قلبی رابطہ ان دو ملاقاتوں کے ذریعے استوار ہوا تھا اُس کی مزید تقویت اور آبیاری کے لئے میں نے اگلے سال یعنی ۱۹۸۰ء میں امریکہ کے تیسرے سفر کے موقع پر ملاقات کی سبیل اس طرح نکالی کہ اُدھر انہیں بھی دعوت دی کہ وہ نیاگرا آجائیں اور اِدھر ٹورنٹو سے میں خود بھی عزیزم عاکف سعید سلمہٗ اور دو احباب یعنی ڈاکٹر نسیم اللہ اور جناب بیگ صاحب کی معیت میں منگل ۱۶ر جون کو نیاگرا پہنچ گیا ۔ جہاں اُن سے کئی گھنٹے کی ملاقات اور گفتگو رہی ۔

مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرے تعلق کا ابتدائی دور

('مولانا مودودی مرحوم اور میں' کی دوسری قسط شائع شدہ اکتوبر ۸۲ء)

مولانا مودودی مرحوم و مغفور سے میرے تعارف کی ابتداء، جیسا کہ میں اس سے قبل بھی بعض مواقع پر عرض کر چکا ہوں، ۱۹۴۵-۴۶ء میں ہوئی تھی جبکہ میں حصار (مشرقی پنجاب، حال ہریانہ، بھارت) میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اس وقت میرے شعور یا نیم شعور، جو بھی اسے قرار دیا جائے، پر اصل تسلط تو علامہ اقبال مرحوم کی ملی شاعری اور مسلم لیگ کی قومی تحریک کا تھا۔ چنانچہ عملاً میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے وابستہ تھا لیکن کچھ ابتدائی کتابچے مولانا مودودی کے بھی میں نے پڑھ لئے تھے اور ان سے ایک گہرا تاثر بھی میرے ذہن نے قبول کیا تھا۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد جو ان دنوں میکلیگن انجنیئرنگ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے مولانا مودودی کی تصانیف کا مطالعہ بالاستیعاب کر رہے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں انہیں اکثر مولانا کی تصانیف کا مطالعہ کرتے اور خالص طالبعلمانہ انداز میں نوٹس تیار کرتے دیکھتا تھا۔ چنانچہ یہی کام کچھ ان کے 'دیکھا دیکھی' اور کچھ اپنے ذاتی شوق کے باعث میں بھی کرتا تھا — اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کے حلقوں میں جب مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو میں انکی جانب سے مدافعت کی کوشش کیا کرتا تھا، اگرچہ عملاً میری کامل وابستگی فیڈریشن اور لیگ ہی کے ساتھ رہی۔

حصار میں ان دنوں چوہدری نذیر احمد مرحوم اور مرزا مسرت بیگ مرحوم

جماعتِ اسلامی کے فعّال اور سرگرم کارکن تھے - میرا ان دونوں ہی حضرات کے یہاں آنا جانا تھا - چوہدری صاحب کے فرزندِ کلاں ڈاکٹر ظہور احمد سے جو آجکل جہانیاں ضلع ملتان میں مطب کرتے ہیں، میرا کافی گہرا دوستانہ تھا — اُن ہی دنوں حِصار میں جماعتِ اسلامی نے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لئے مولانا صدرالدین اصلاحی بھی حِصار میں مقیم رہے تھے - ان کی بھی اُس زمانے کی ایک ہلکی سی جھلک میرے حافظے کے کسی گوشے میں تاحال محفوظ ہے -

فیڈریشن کی تنظیم کے سلسلے میں میرا ضلع حِصار کے دوسرے قصبات خصوصًا سرسہ اور ہانسی بھی جانا آنا رہتا تھا - سرسہ میں میرے قریبی اعزّہ کا ایک خاندان آباد تھا - یعنی میرے والد مرحوم کے حقیقی ماموں جن کے دو صاحبزادگان ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی جو 'اُردو ڈائجسٹ' کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں - ان کے ایک برادرِ بزرگ حافظ افروغ حسن اُن دنوں جماعتِ اسلامی میں باضابطہ بطور رکن شامل ہو چکے تھے - بنابریں اس گھرانے میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کا بہت چرچا تھا - اس ناطے میرا ذہنی تعلق مولانا مودودی کے ساتھ مزید گہرا اور پختہ ہوا - سرسہ کے قریب ہی جماعتِ اسلامی کے رفقاء نے 'دارالاسلام' پٹھانکوٹ کے طرز پر ایک مثالی بستی گویا 'مِنی' (MINI) دارالاسلام' قائم کی تھی جس کی رُوحِ رواں حکیم عبداللہ روڑوی مرحوم و مغفور تھے - میرا وہاں بھی اکثر آنا جانا رہتا تھا - اور اس کی بعض جھلکیاں بھی میری یادداشت میں تاحال محفوظ ہیں!

۴۶ء کی تعطیلات موسم گرما کے ایک یادگار سفر کا مختصر ذکر میں اُس روداد میں کر چکا ہوں جو جنوری فروری ۸۰ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تھی اور جس کا حوالہ اس تحریر کے آغاز میں بھی آچکا ہے - اُس کے دوران، میں نے بھائی اظہار صاحب کی معیت میں دو یا تین دن 'دارالاسلام' پٹھانکوٹ میں بھی

بسر کئے تھے۔ اُس کی بھی جو یادیں اب تک حافظے میں محفوظ ہیں اُن میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں :

مولانا امین احسن اصلاحی کا درسِ قرآن نمازِ فجر کے بعد ہوتا تھا۔ اُس میں فضا بالعموم بہت بوجھل ہوتی تھی اور نہ صرف یہ کہ علمی وقار و متانت کا رنگ غالب رہتا تھا بلکہ رُعب اور دبدبے کی کیفیت قائم رہتی تھی۔ جبکہ مولانا مودودی کا جو درسِ حدیث نمازِ ظہر کے بعد ہوتا تھا اُس میں ماحول بالعموم شگفتہ رہتا تھا جس میں کبھی کبھی طنز و مزاح کا رنگ بھی شامل ہو جاتا تھا اور بالخصوص جناب عبدالعزیز شرقی اپنے دلچسپ سوالات کے ذریعے اس کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ جن کے جواب میں اکثر "مولویوں" کی "موشگافیوں" پر طنز کا عنصر شامل ہو جاتا تھا۔

البتہ بالمشافہ ملاقات میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ چنانچہ مولانا مودودی سے ملاقات آسان نہ تھی جبکہ مولانا اصلاحی سے ہر وقت ملا جا سکتا تھا۔ پھر گفتگو کے دوران بھی مولانا مودودی سے قدرے بُعد اور فاصلے کا احساس طاری رہتا تھا جبکہ مولانا اصلاحی بالکل 'گھُل مل' کر بات کرتے تھے۔ ایک 'فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا یہ نقشہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ ہم نے ایک بار مولانا مودودی کے کمرے میں جھانکا تو اسے نہایت آراستہ پیراستہ پایا، فرش پر قالین بھی تھا، میز کرسی بھی ڈھنگ کی تھی اور ملاقاتیوں کے لئے بھی صوفہ موجود تھا۔ مولانا مودودی اس وقت اپنی گردن گھومنے والی کرسی کی پشت پر ٹکائے، آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ چنانچہ انہیں ہمارے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے کی بالکل خبر نہ ہوئی اور ہم نے بھی مزید مخل ہونا مناسب نہ سمجھا ——— جبکہ مولانا اصلاحی کے کمرے میں ایک نہایت سادہ سی میز تھی اور اسی قسم کی ایک کرسی جس پر مولانا تشریف فرما تھے۔ اور سامنے بھی ایک بوسیدہ سا بنچ تھا جس پر ملاقاتی بیٹھتے تھے۔ چنانچہ وہاں ہم دونوں بھائی کافی دیر تک بیٹھے مولانا سے باتیں کرتے رہے اور ہم نے مولانا سے کسی قسم کا بُعد یا فصل محسوس نہیں کیا۔

مولانا اصلاحی کے صاحبزادے ابوصالح مرحوم اور مولانا عبدالجبار غازی مرحوم و مغفور کے صاحبزادے عرفان غازی نے "دارالاسلام" میں روزمرہ کی ضروریات کی ایک چھوٹی سی دکان کھول ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے بھی ان سے کچھ چیزیں بالکل بلاضرورت، خریدی تھیں۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور فسادات میں ہم جن مراحل سے گذرے اُن کی تفصیل تو ظاہر ہے کہ اس وقت نہ ضروری ہے نہ ممکن۔ البتہ اُن ایام کا ایک واقعہ میری آئندہ زندگی کے رُخ کی تعیین کے اعتبار سے یقیناً بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ جب ہم حصار میں ہندوؤں کے حملوں کے باعث محصور ہو گئے تو ان دنوں میں اور بھائی جان ایک مسجد میں "ترجمان القرآن" کے پرچوں میں شائع شدہ "تفہیم القرآن" کی اقساط کا مل جُل کر مطالعہ کرتے تھے جن میں اُن دنوں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ میں نے ان دنوں تازہ تازہ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا جس میں سائنس کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی بطور مضمون پڑھی تھی اور کچھ اپنے ذاتی شوق اور زیادہ تر استاذِ محترم مولانا محمد حسن مرحوم و مغفور کی مشفقانہ محنت کے نتیجے میں اُس میں خاصی استعداد بہم پہنچالی تھی۔ اُدھر بھائی جان نے بھی اگرچہ میٹرک تو اسی طرح سائنس اور عربی دونوں کے ساتھ ہی کیا تھا لیکن چھ سال گذر جانے کے باعث اُن کا عربی قواعد کا علم پُرانا ہو چکا تھا۔ چنانچہ "عربی دانی" میں فی الوقت میرا پلڑا اُن سے بھاری تھا۔ چنانچہ جب کسی معاملے میں بحث کی نوبت آجاتی تھی تو اکثر و بیشتر انہیں میری بات ماننی پڑتی تھی — بہرحال اصل قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ میرا قرآن حکیم کے مطالب و معانی سے پہلا تعارف تھا جو سورۂ یوسف کی "تفہیم" کے ذریعے ہوا — اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اصلاً سورۂ یوسف کی اپنی چاشنی اور مٹھاس اور پھر ع "ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیان اپنا!" کے مصداق مولانا مودودی کے اندازِ تعبیر و تفہیم کو میرے قرآن حکیم کے ساتھ آئندہ ربط و تعلق کی استواری

میں اہم دخل حاصل ہے جس کے لئے میں مولانا مودودی کا تا زیست ممنونِ احسان رہوں گا۔

حصار کی 'محصوری' کے انڈین آرمی کے ہاتھوں زبردستی خاتمے — اور پھر کچھ عرصہ ایک نوتعمیر شدہ جیل میں قائم 'کیمپ' میں گزار کر جب ہمارا خاندان آگ اور خون کے دریا عبور کرتے ہوئے حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک ایک سو ستر میل کا فاصلہ بیس دنوں میں ایک پیدل قافلے کے ساتھ طے کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین 'پاکستان' پہنچا تو بھائی جان نے تو پہلے کچھ عرصہ مہاجرین کے کیمپوں میں جماعتِ اسلامی کی جانب سے ہونے والے امدادی کام میں صرف کیا اور پھر وہ ایس - ڈی - او محکمۂ انہار کی حیثیت میں اپنی تقرّری کا پروانہ لیکر پہلے چیچہ وطنی اور پھر پاکپتن چلے گئے اور میں کرشن نگر لاہور میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی (میڈیکل) میں داخل ہو گیا۔

ایف ایس سی کے دو سالوں کے دوران میں نے جماعتِ اسلامی کے کرشن نگر لاہور کے حلقہ ہمدرداں میں نہایت تندھی اور سرگرمی سے کام کیا - بلکہ یہ کہنا ہرگز مبالغے پر مبنی نہیں ہے کہ اس حلقے کی اصل رُوحِ رواں میں ہی تھا۔ چنانچہ میں ہی اس کے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کرتا تھا اور اُس میں مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کر سُناتا تھا - اور میں نے ہی اُس کا ایک 'دارالمطالعہ' قائم کیا تھا جس کا سائن بورڈ بھی خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا — گوالمنڈی میں واقع 'دفترِ کوثر' میں جو ہفتہ وار اجتماعات جماعتِ اسلامی لاہور کے اُن دنوں ہوتے تھے اُن میں بھی میں پابندی سے شرکت کرتا تھا اور وہاں گاہے بگاہے مولانا مودودی کی زیارت اور ان کے 'تبصرے' سننے کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی تھی جو وہ مختلف حلقوں کی رپورٹوں پر کرتے تھے — ریڈیو پاکستان سے 'اسلام کا نظامِ حیات' کے عنوان سے جو پانچ تقریریں مولانا کی اُن دنوں نشر ہوئیں اُن کو

ہم کرشن نگر کے چوک میں دریاں بچھا کر ایک جلسے کی صورت میں خود سننے اور دوسروں کو سنانے کا اہتمام کرتے تھے ـــــ اغلباً اپریل ۴۸ء میں جماعت اسلامی کے زیرِ اہتمام پاکستان میں جو پہلا جلسۂ عام موہنی روڈ لاہور پر واقع خالصہ ہائی اسکول کے میدان میں ہوا تھا اُس میں میں نے پہلی بار مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی مفصل تقاریر براہِ راست سُنیں - مولانا مودودی کی تقریر کا عنوان تھا "مطالبۂ نظامِ اسلامی" اور اصلاحی صاحب کی تقریر کا موضوع تھا "آزادی کے اسلامی تقاضے" ـــــ اور ان دونوں بزرگوں کی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹوں کی تقریروں کے دوران میری آنکھوں کے کیمرے کے ذریعے ان کی اُس وقت کی شبیہوں کا جو عکس میرے شعور کی سطح پر مرتسم ہوا تھا وہ میرے ذہن کے 'محافظ خانے' میں تاحال محفوظ ہے ـــــ تاہم اُس وقت تک ان دونوں بزرگوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت یہ تھی کہ اپنے اور ان کے مابین محبّت و عقیدت کے انتہائی قُرب کے باوصف مقام اور مرتبے کا طویل اور ناقابلِ عبور فاصلہ حائل معلوم ہوتا تھا اور دُور سے ان کی زیارت کرتے ہوئے میں بالکل ایسے محسوس کرتا تھا جیسے کسی بلند و بالا فصیل کے دامن میں کھڑا سر اونچا کئے اس کی کسی بلند بُرجی کو دیکھ رہا ہوں -

---

لیکن جلد ہی یہ فاصلے کم ہونے شروع ہو گئے - اس کا ایک سبب تو بالکل فطری اور ریاضیاتی تھا یعنی یہ کہ ۴۷ء میں میری عمر ۱۵ سال تھی اور مولانا مودودی کی ۴۴ سال - گویا کہ نسبت ایک اور تین کی تھی - لیکن ۶۰ء میں مولانا کی عمر ۵۷ برس کی تھی اور میری ۲۸ برس گویا نسبت کم ہو کر ایک اور دو کی رہ گئی ـــ لیکن دوسرا اور اہم ترسبب یہ ہوا کہ بعض اسباب سے میں جماعتِ اسلامی اور جمعیتِ طلبہ کے حلقوں میں نمایاں ہو گیا اور اس طرح اِن 'اکابر' کی نگاہوں میں بھی آ گیا ـــ اور اس طرح فاصلے کم ہوتے چلے گئے -

ہُوا یوں کہ جیسے ہی مَیں نے ایف ایس سی پاس کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل

کالج لاہور میں ایم بی بی ایس کلاس میں داخلہ لیا میں نے اپنی رہائش بھی کالج کے ہاسٹل میں منتقل کر لی اور اس طرح اب میرا رابطہ جماعتِ اسلامی کی بجائے اسلامی جمعیتِ طلبہ سے قائم ہو گیا - اور چونکہ مجھے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کا خاصا عملی تجربہ حاصل تھا، لہٰذا میں جمعیت میں ایک دم فعّال اور سرگرم ہو گیا اور سالِ اوّل کے دوران ہی مجھے جمعیتِ لاہور کے حلقہ میڈیکل کالج کا ناظم بھی مقرّر کر دیا گیا - اور اکثر و بیشتر جمعیت کے اجتماعات میں درسِ قرآن کی ذمہ داری بھی میرے ہی سپرد ہونے لگی -

اُدھر موسم گرما کی تعطیلات میں میں والدین کے پاس منٹگمری (حال ساہیوال) جاتا تھا تو وہاں کی مقامی جماعت کے ساتھ سرگرمی سے کام کرتا تھا اور میرے درسِ قرآن کا کچھ ایسا شہرہ جماعت کے قریبی حلقوں میں ہو گیا تھا کہ وہاں بھی تمام تر کم علمی اور نوعمری کے باوجود درسِ قرآن کی ذمہ داری مجھ ہی پر ڈالی جاتی تھی -

۱۹۵۸ء میں مولانا مودودی نے پنجاب کے صوبائی انتخابات کے ضمن میں پورے صوبے کا تفصیلی اور طوفانی دورہ کیا تو اس کے سلسلے میں منٹگمری میں میں نے نہایت تندہی سے کام کیا مجھے اب تک یاد ہے کہ روزنامہ 'تسنیم' کا انتخابات نمبر میں نے تانگے پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اُس میں شائع شدہ پنجابی نظمیں ترنّم سے پڑھتے ہوئے پورے شہر کا چکّر لگا کر فروخت کیا تھا ـــــ اور پھر جب مولانا مودودی اس دورے کے سلسلے میں منٹگمری تشریف لانے والے تھے تو میں نے برادرم نبی احمد خان لودھی (جواب حکومتِ پاکستان کے شعبۂ اطلاعات سے متعلق ہیں) کی معیّت میں ایک کار پر لاؤڈ سپیکر نصب کر کے منٹگمری سے عارف والہ، وہاں سے پاکپٹن اور پھر وہاں سے واپس منٹگمری کا تقریباً ایک سو میل کا سفر اس شان سے کیا تھا کہ پورے راستے کے دوران سڑک کے قریب کی تمام آبادیوں اور دیہات میں چھوٹی چھوٹی تقریریں کر کے لوگوں کو مولانا کے جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی - جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا تھا اور دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ مولانا کی تقریر سننے کے لئے منٹگمری آئے تھے ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ منٹگمری کے اُس پاس کے دیہات کے باشندے بالخصوص وہ جنہیں عرفِ عام میں 'جانگلی'

کہا جاتا ہے مولانا کی شستہ اردو نہ سمجھ سکے اور مایوس ہو کر لوٹ گئے ـــــ اس موقع پر میں نے مولانا مودودی کو برادرم علی احمد کے تعاون سے منٹگمری کے طلبہ کی جانب سے ایک عصرانہ بھی دیا تھا جس میں ایک باضابطہ "سپاسنامہ" بھی مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، جو لکھا بھی میں نے تھا اور پڑھا بھی میں نے ہی تھا - (اور غالباً جماعتِ اسلامی کی تاریخ میں "سپاسناموں" کی "بدعت" کا آغاز اسی سے ہوا تھا جس پر بعد میں مجھے ہمیشہ شرمندگی کا احساس ہوتا رہا!)

اس موقع پر اوکاڑہ میں جو اجتماع جماعتِ اسلامی کے زیر اہتمام ہوا تھا اُس میں بھی مَیں نے طلباء کا ایک علیحدہ اجلاس منعقد کرایا تھا جس میں میں نے مولانا کی موجودگی میں اپنی پہلی ارتجالی تقریر کی - جس سے مولانا بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس کی دل کھول کر تحسین فرمائی اور اس طرح میں ذاتی طور پر ان کی نگاہوں میں آتا چلا گیا -

---

۱۹۵۱ء میں جب الیکشن بالفعل منعقد ہوئے تو وہ میرے میڈیکل کی تعلیم کے دوران کے مشکل ترین امتحان (یعنی فرسٹ پروفیشنل) کے دن تھے - لیکن پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی جو دُھن اس زمانے میں جماعت اور جمعیت کے ہر رکن اور کارکن پر سوار تھی اس کے زیر اثر میں نے بھی رات دن ایک کر کے محنت کی اور اپنی تعلیم اور کیریر کے کسی خیال کو ذہن کے قریب نہ آنے دیا - لیکن پھر جب اُس میں جماعت کو شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا - تو کچھ اس کے صدمے کے باعث اور کچھ اس لئے کہ اُس کے فوراً بعد رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اور اس کے فوراً بعد امتحان ہوا، میری صحت جواب دے گئی - اور ابھی امتحان کے تحریری پرچے ہی ہوئے تھے اور پریکٹیکل باقی تھے کہ مجھ پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہو گیا - نتیجۃً اس کے باوجود کہ تحریری پرچوں میں میں نے پوری کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی، مجھے پورا امتحان (ستمبر ۱۹۵۱ء میں) دوبارہ دینا پڑا - (اور الحمدللہ کہ میرے پورے تعلیمی کیریر کا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے!) -

اواخر ۵۱ء سے اواخر ۵۳ء تک، دو سال کا عرصہ میرے مولانا مودودی سے انتہائی قرب کا زمانہ ہے۔ جس کے دوران مجھ پر مولانا کی بزرگانہ شفقتیں اور مربیانہ عنایتیں اس حد کو پہنچ گئیں کہ عمر اور مقام و مرتبے کے 'بعد المشرقین' کے علی الرغم بے تکلفی کا عالم یہ ہو گیا کہ 'باہمی' گفتگو میں طنز و مزاح کا استعمال بھی 'دو طرفہ' ہونے لگا۔

نومبر ۵۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو جلسۂ عام دائی ایم سی اے ہال لاہور میں منعقد ہوا، اس میں جو تقریریں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی زیر صدارت کی اُس کا جمعیت اور جماعت کے حلقوں میں بہت شہرہ ہوا۔ خود مولانا اصلاحی نے اُس کی نہایت دل کھول کر تحسین و تعریف کی۔ چنانچہ جماعت کے مرکز کے حلقے میں بھی اُس کا بہت چرچا ہوا۔ (یہ تقریر طویل عرصے تک "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا 'جزو لاینفک' رہی — اور غالباً اب بھی ہے!)

غالباً یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اواخر دسمبر ۵۱ء میں جب میں نے لاہور میں جمعیت کے زیر اہتمام ایک 'تربیت گاہ' منعقد کی جس میں درس قرآن مولانا اصلاحی نے دیا اور درس حدیث مولانا مودودی نے، تو اس کے بالکل آغاز ہی میں میں نے محسوس کر لیا کہ مولانا مودودی کے دل میں میرے لئے شدید محبت و شفقت موجود ہے — اور میں اُن کی خصوصی توجہ اور التفات کا مرکز ہوں۔ میرے لئے اِس احساس میں جو سرور اور کیف مضمر تھا اس کا اندازہ، ہر شخص بآسانی کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی کے وہ دس دن جو ۲۲ تا ۳۰ دسمبر ۵۱ء ان بزرگوں کی شفقت و عنایت کے سائے میں بسر ہوئے "حاصل زیست" نہیں تو ایک متاعِ گرانمایہ ضرور ہیں۔ اسی لئے کہ ایک تو انہی دنوں کے دوران میرا 'تدبر قرآن' کے 'فراہی' 'مکتب فکر' سے ابتدائی تعارف ہوا — اور دوسرے اِن ہی ایام کے قرب پیہم کے نتیجے میں مولانا مودودی سے 'بے تکلفی' کا آغاز ہوا — اور بعد و فصل کے سارے حجابات اُٹھتے چلے گئے۔

مولانا مودودی کی جانب سے بے تکلفی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے

کہ ایک روز میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "آج آپ ہمیں اپنے کچھ حالاتِ زندگی سنائیے!" تو مولانا نے بے ساختہ فرمایا "گویا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اپنا 'مولود شریف' خود پڑھوں!" جس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

اِدھر اپنی بے تکلفی یا "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" کے مصداق 'گستاخی' کی یہ مثال قابلِ ذکر ہے کہ تربیت گاہ کے آخری دن ہم نے جملہ اساتذہ اور مربّی حضرات کے لئے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا — تو جب میں نے مولانا مودودی سے اس کا ذکر کیا اور انہیں شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا: "اچھا — لیکن پھر میں بھی کوئی چیز لے کر آؤں گا!" — اس پر میں نے بلا جھجک کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو پھر ہم لوگ مرغی پکا رہے ہیں، آپ بھی کوئی مقابلے کی چیز لے کر آئیے گا!" اگرچہ مولانا نے 'مجھے اس کا یہ بھرپور' جواب دے کر محفل کو زعفران زار بنا دیا کہ "مرغی کے مقابلے کی چیز تو بلّی ہے!" — — — —

نومبر ۵۱ء کے سالانہ اجتماع میں مجھ پر جمعیت کی دو اہم ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔ ایک جمعیتِ لاہور کی نظامت کا — اور دوسرے جمعیتِ پنجاب کی نظامت کا — اور واقعہ یہ ہے کہ اس سال میں نے جس جوش و خروش اور تندہی سے کام کیا اُس کا تصوّر اب کرتا ہوں تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جمعیت اگرچہ قائم بھی لاہور ہی میں ہوئی تھی اور وہیں کئی سال تک کا اس کا مرکز قائم رہا تھا لیکن اس وقت تک لاہور میں اُس کی حیثیت طلبہ کے ایک لٹریری سرکل سے زیادہ نہ تھی۔ اور بقیہ پنجاب میں تو اس کا کہیں نام و نشان تک موجود نہ تھا — لے دے کر صرف راولپنڈی میں ایک جمعیت تھی جو کبھی ماضی میں کسی قدر فعّال رہی تھی لیکن اُس وقت اُس کے صرف کچھ 'آثار' باقی تھے اور وہ بھی نہایت خستہ اور لوسیدہ حالت میں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سال قبل جمعیت کا مرکز لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ پنجاب میں جمعیت نیم مردہ حالت میں ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میں نے جیسے ہی اس کا چارج سنبھالا اس میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے — چنانچہ میں نے 'تربیت گاہ' سے فارغ ہوتے ہی جنوری ۵۲ء میں پورے پنجاب کا ایک طوفانی دورہ کیا۔

جس کے دوران کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے۔

ہوا یوں کہ میں اور برادرم نذیر احمد خالد (جو مجھ سے دو سال جونیئر تھے ——— اور آج کل ایک غیر ملکی دوا ساز فرم میں اہم عہدے پر فائز ہیں) سیالکوٹ کے دورے کے لئے صبح چار بجے لاہور سے نکلے۔ طے یہ تھا کہ سکولوں میں تقریریں وہ کریں گے اور کالجوں میں مَیں کروں گا۔ انہوں نے اپنی تقریر خوب محنت سے تیار بھی کر لی تھی۔ لیکن سیالکوٹ میں جب پہلے ہائی اسکول میں جلسہ ہوا اور پانچ سات سو طلبہ اور پچیس تیس اساتذہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا "سمندر" اُن کے سامنے آیا تو اُن کی گھگھی بندھ گئی ——— اور چند جملے کہنے کے بعد وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ بقیہ تقریر اسرار احمد صاحب کریں گے ——— میرے لئے ظاہر ہے کہ یہ ایک ناگہانی آفت سے کم نہ تھی لیکن الحمد للہ کہ میں نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن میں میں نے تین ہائی اسکولوں میں تقریریں کیں اور دو کالجوں میں۔ ایک قدیم مرے کالج (MURRAY COLLEGE) اور دوسرے جناح اسلامیہ کالج (جو اُن ہی دنوں قائم ہوا تھا اور اس کا غالباً پہلا ہی سال تھا) ——— اور صورت یہ رہی کہ ایک درسگاہ سے نکلے تو فوراً دوسری میں جا داخل ہوئے۔ نتیجۃً پورے دن کچھ کھانے پینے کا نہ ہوش آیا نہ موقع ملا۔ شام کو چار بجے فارغ ہوئے اور خیال ہوا کہ اب کچھ "خورد و نوش" کا معاملہ ہوگا تو جناب آسی ضیائی رامپوری نے اطلاع دی کہ لاہور کے لئے آخری بس کی روانگی کا وقت ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُسی طرح خالی پیٹ لاہور واپسی ہو گئی۔ جہاں رات گئے پہنچنے کے باعث ہاسٹل کا کچن بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ رات بھی ویسے ہی خالی پیٹ بسر ہوئی ——— بہرحال میری اس بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنجاب میں جمعیت ایک دم فعّال اور نمایاں ہو گئی۔ اور اب اس کی حیثیت طلبہ کے ایک مذہبی اور لٹریری سرکل سے بڑھ کر اسلامی تحریک کی ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی اطلاعات مولانا مودودی کو بھی پنجاب کے طول و عرض سے مل رہی ہوں گی۔ اور اُس کے نتیجے میں اُن کے دل میں میرے لئے شفقت و محبت کے جذبات بڑھ رہے ہوں گے۔ جس کا ایک نمایاں اظہار بھی اُن ہی دنوں ہو گیا۔

فروری ۱۹۵۲ء میں میں نے لاہور میں جمعیتِ پنجاب کا ایک سہ ماہی اجتماع منعقد کیا - اور اس موقع پر برکت علی اسلامیہ ہال میں میں نے خود مولانا ہی کے زیرِ صدارت وہ تقریر کی جو جمعیت کے لٹریچر میں "ہم اور ہمارا کام" کے عنوان سے شامل ہے - تو مولانا نے اسے بہت سراہا - اُن کے دو فقرے میری لوحِ قلب پر تا حال نقش ہیں --- ایک یہ کہ "پاکستان کے طلبہ کے حالات کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے وہ آپ ہی کی زبان سے موزوں تھا! یہی باتیں اگر ہم کہتے (واضح رہے کہ اس محفل میں مولانا اصلاحی بھی موجود تھے!) تو طلبہ کو شکایت ہو سکتی تھی" اور دوسرا یہ کہ "آپ نے اپنی اس تقریر میں جو کچھ کہا ہے ہم بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے --- بس تھوڑا سا فرق صرف شخصیت کا باقی رہ جاتا ہے!" مجھے اُس وقت بھی پورا احساس تھا کہ مولانا یہ باتیں میری حوصلہ افزائی کے لئے فرما رہے ہیں لیکن بہرحال اس میں محبت و شفقت اور اپنائیت کے احساس کا جو رس گھلا ہوا تھا میرے لئے اصل اہمیت اُس کی تھی! -

۱۹۵۲ء کی موسمِ گرما کی تعطیلات میں میں نے --- "مشرف گرچہ شُد جامی زِ لطفش - خدایا آں کرم بارے دِگر کُن!" کے مصداق دسمبر ۱۹۵۱ء کی تربیت گاہ کے لطف کو مکرر اور دو بالا کرنے کے لئے پھر ایک طویل تر تربیت گاہ منعقد کی - اور ایک بار پھر مولانا امین احسن اصلاحی سے درسِ قرآن حاصل کیا اور تدبرِ قرآن کے اُصول و مبادی سیکھے اور "تزکیۂ نفس" پر لیکچر سُنے - اور مولانا مودودی سے درسِ حدیث حاصل کیا - اور مختلف تحریکی مسائل پر تفصیلی گفتگوئیں سنیں - اور آزادانہ تبادلہ خیال ہی نہیں باقاعدہ بحث و تمحیص کے ذریعے دعوتی اور تحریکی معاملات میں بصیرت حاصل کی ---- اِس دوسری تربیت گاہ کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے دوران ہم نمازِ تہجد مولانا مودودی کی امامت میں ادا کرتے رہے --- اور تہجد کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کی دلآویز ترتیل سے محظوظ ہوتے رہے - اور اس کے دوران میرے لئے کسی قدر قابلِ فخر اور دوسرے ساتھیوں کے لئے حد درجہ قابلِ رشک بات یہ رہی کہ اکثر مولانا اپنے کمرے سے ننگے سر ہی آجاتے تھے اور پھر میری قراقلی ٹوپی پہن کر نماز

پڑھاتے تھے — (میری وہ ڈیوٹی بعد میں جمعیت کے احباب کے حلقوں میں بہت عرصے تک مشہور رہی!)

اب صحیح یاد نہیں کہ یہ واقعہ دسمبر ۵۱ء کی تربیت گاہ میں پیش آیا تھا یا ۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات کی تربیت گاہ میں — لیکن ہے بہت دلچسپ اور قابل ذکر۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر مولانا کی جو تحریر و تفہیمات، میں شامل ہے مجھے وہ پسند نہ تھی چنانچہ میں نے اس پر تربیت گاہ کے دوران مولانا سے گفتگو کی اور ان کا نقطۂ نظر مزید وضاحت سے معلوم کیا۔ پھر میں نے مولانا اصلاحی صاحب سے بات کی تو انہیں کسی درجے میں نظریۂ ارتقاء کا قائل پایا۔ بس یہاں سے میری 'شرارت' شروع ہو گئی۔ میں روزانہ مولانا اصلاحی سے نظریۂ ارتقاء کے حق میں قرآنی دلائل اور استشہادات حاصل کر لیتا اور پھر مولانا مودودی سے اُن کی بنیاد پر بحث کرتا۔ مولانا میرے اس 'علم قرآنی' سے حیران بھی ہوتے اور اُس کی تحسین بھی فرماتے اور پھر اپنے اعتراضات وارد کرتے۔ میں اگلے روز وہ اعتراضات مولانا اصلاحی کے سامنے رکھتا تو وہ بھی حیرت آمیز مسرت کا اظہار فرماتے اور اپنے موقف کے حق میں مزید دلائل دیتے۔ تربیت گاہ کے بقیہ تمام شرکاء ان بحثوں کو سنتے اور محظوظ ہوتے (اور میری 'قرآن دانی' پر زیر لب مسکراتے بھی رہتے!)۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چرچا جماعت کے مرکز میں بھی ہوا اور وہاں یہ راز کھل گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بحث طلبہ کے ساتھ نہیں بلکہ اصلاً مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ہو رہی ہے، بواسطۂ اسرار۔ چنانچہ جناب نعیم صدیقی نے ہمیں اس 'شرارت' سے روکا۔ اور اس پر قدرے سرزنش بھی کی۔

بہرحال میری سال بھر کی بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۵۲ء کے اواخر میں جب اسلامی جمعیتِ طلبہ کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا تو ایک تو اُس موقع پر اجلاسِ عام کسی ہال میں نہیں بلکہ پہلی بار ایک کھلے میدان (یعنی گول باغ لاہور) میں ایک جلسۂ عام کی صورت میں منعقد ہوا — اور

دوسرے مجھے آئندہ سال (۵۳-۱۹۵۲ء) کے لئے جمعیت کا آل پاکستان ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ اور اس طرح ایک تو جمعیت کا مرکز دوبارہ لاہور منتقل ہو گیا۔ اور دوسرے میرے مولانا مودودی سے مزید قریبی روابط کی راہ نکل آئی۔ اس لئے کہ مختلف تنظیمی اور تحریکی مسائل پر مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے میں اکثر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ جہاں میرے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ بلکہ جماعت کے مرکز کے اکثر کارکن اس پر حیرت کا اظہار بھی کرتے تھے اور کسی قدر رشک (یا حسد؟) میں بھی مبتلا تھے کہ اس کے باوجود کہ مولانا کی زندگی بہت منضبط تھی اور وہ اپنے اوقاتِ کار کی سختی سے پابندی نہ صرف خود کرتے تھے بلکہ دوسروں سے بھی کرواتے تھے، میرے لئے اُن کا دروازہ ہر وقت کھلا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے چند ساتھیوں سمیت مولانا کی خدمت میں رات کے گیارہ بجے حاضر ہوا اور مولانا نے ہمیں اپنی خوابگاہ ہی میں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔

فروری ۵۲ء میں منعقدہ اجتماعِ جمعیتِ پنجاب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُس کا ایک اور واقعہ بھی بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے اور آگے بڑھنے سے قبل اُس کا تذکرہ مناسب رہے گا ــــ ہوا یہ کہ مولانا نے جو تقریر اُس روز میری تقریر کے بعد فرمائی اُس میں یہ الفاظ بھی تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ایک جانب دعوتی اور تحریکی مشاغل میں بھرپور حصہ لیں ــــ لیکن دوسری جانب اپنی تعلیم میں بھی دوسروں سے ہرگز پیچھے نہ رہیں بلکہ اُس میدان میں بھی اپنے ساتھی طلبہ سے آگے رہیں ــــ!" میں نے جب مولانا کی اس نصیحت کی روشنی میں اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ یہ ایک ناقابلِ عمل بات ہے۔ چنانچہ میں اُسی رات مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سر آنکھوں پر لیکن یہ ہے ناممکن العمل! ــــ میں نے پرائمری سے اُس وقت تک کا پورا ریکارڈ مولانا کے سامنے رکھ دیا کہ میں نے پرائمری میں بھی وظیفہ حاصل کیا تھا۔ پھر مڈل کے وریکلر فائنل کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ پھر میٹرک میں میں متحدہ پنجاب کے تمام مسلمان طلبہ میں چوتھے نمبر پر

تھا اور میرے اپنے اسکول میں جو طالب علم میرے بعد دوسرے نمبر پر تھا اُس کے اور میرے نمبروں میں ۹۰ کا فرق تھا (میں نے کل ۸۵۰ میں سے ۷۱۸ نمبر حاصل کئے تھے اور اُس نے ۶۲۸) بعد ازاں میں نے ایف ایس سی میڈیکل میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور میرٹ (MERIT) سکالرشپ حاصل کیا۔ پھر میڈیکل کالج میں فرسٹ ائیر میں میں کلاس میں اوّل رہا اور ایک مزید وظیفہ مجھے ملا (چنانچہ میڈیکل کالج کے سالِ دوم کے دوران میرے پاس دو وظائف تھے!) — لیکن اب جمعیت کی جو گوناگوں ذمہ داریاں میرے کاندھوں پر آگئی ہیں اُنکے پیشِ نظر میرے لئے ناممکن ہے کہ میں اپنی اُس پوزیشن کو برقرار رکھ سکوں — تو فرمایئے کہ میں کیا کروں؟ — اِس پر مولانا نے نہ صرف یہ کہ کھلے دل کے ساتھ اپنی غلطی کو تسلیم کیا بلکہ پوری صفائی کے ساتھ اعتراف فرمایا کہ — "میرا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے جماعتِ اسلامی کی تحریک عوامی دور میں داخل ہوئی ہے میرا مطالعہ بالکل منقطع ہو چکا ہے اور اب میں صرف اپنے سابقہ مطالعے سے کام چلا رہا ہوں!!" — کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ مولانا کے الفاظ مجھے تا حال جوں کے توں کیسے یاد رہ گئے کہ میں انہیں واوین (یعنی INVERTED COMAS) کے ساتھ نقل کر رہا ہوں — واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے یہ الفاظ میرے لوحِ قلب پر کندہ ہیں اس لئے کہ میری اپنی زندگی کے آئندہ رُخ کی تعیین میں ان کو فیصلہ کن دخل حاصل ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی میں دنیوی مستقبل (CAREER) اور پیشہ و فن (PROFESSION) کو ثانوی درجہ دینے اور دعوت و اقامت دین کی جدّوجہد کو اوّلیت دینے کا فیصلہ غیر شعوری طور پر نیم دِلی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری طرح جانتے بوجھتے اور خالص شعوری طور پر کیا تھا اور اس میں مولانا کے ان الفاظ کو بھی اہم دخل حاصل ہے —!

۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان

میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر رکھ دیا۔ چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لا نافذ ہوا۔ اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دور رس اثرات مترتب ہوئے۔

۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے اُن زعماء نے کیا تھا جو ۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکستِ فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے اور اب اچانک اینٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظرِ عام پر ظاہر ہوئے تھے —— لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دلی آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے۔ دلی آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرِفہرست حلقۂ دیوبند کے وہ علماء کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت کانگرس کے ہمنوا رہے تھے —— اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں نمایاں اوّلاً حلقۂ دیوبند کے مسلم لیگی علماء اور ثانیاً بریلوی مکتبِ فکر کے علماء و زعماء تھے —— جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی اس معاملے میں بالکل "نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی!" والے مخمصے میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے کہ جماعت کی تاسیس جن اُصولی نظریات کی بنیاد پر ہوئی تھی اُن کی رُو سے اُس کا اِس تحریک میں حصّہ لینا کسی طور سے صحیح نہ بنتا تھا —— لیکن سیاسی اکھاڑے میں اتر جانے کے باعث عوامی دباؤ کو بالکل نظرانداز کر دینا بھی اُس کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اُس کا معاملہ مسلسل "نیمے دروں نیمے بروں" کا رہا یعنی یہ کہ بظاہر تحریک میں شامل بھی ہیں لیکن بباطن، اُس سے علیحدہ اور بری بھی —— !! —— بہرحال اس وقت پیشِ نظر اس طویل اور تلخ داستان کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ اُس زمانے میں میرا نہایت قریبی رابطہ مولانا سے قائم رہا اور اس پورے معاملے کے دوران کی نشیب و فراز کا علم مجھے بہت قریب سے ہوتا رہا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز متحدہ مجلسِ عمل نے "راست اقدام" یعنی Direct Action کے آغاز کا اعلان کیا —— اور جماعتِ اسلامی

کی جانب سے یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ہم اس راست اقدام میں تو شریک نہیں ہیں "البتہ ہم نے اپنے حصّے کا کام اپنے ذمّے لے لیا ہے" اُس روز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے اور میں نے پہلی بار اُن کی زبان سے انگریزی کا ایک محاورہ سنا ـــ مولانا نے فرمایا: "ہم اس پوری صورتِ حال سے WITH FLYING COLOURS ، نکلے ہیں" ـــ لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ خوش فہمی بہت عارضی ثابت ہوئی اور نہ صرف یہ کہ حکومت کے 'جوابی اقدام' کی لپیٹ میں دوسرے علماء و زعماء کے ساتھ ساتھ مولانا بھی آگئے بلکہ وقت کے بعض 'فراعنہ' نے جو موقع کی تاک ہی میں تھے بھرپور وار کیا اور مولانا پر مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مقدّمہ قائم کر دیا۔

یہ زمانہ، جمعیت اور جماعت کے ہزاروں کارکنوں کی طرح مجھ پر بھی رنج و غم کی شدّت اور حُزن و ملال کے غلبے کا تھا۔ (۱۹۵۳ء کو عہدِ حاضر کی اِس اسلامی تحریک کا جو جماعتِ اسلامی کے تحت جاری تھی 'عام الحزن' قرار دیا جائے تو یہ بات غلط نہ ہو گی!) جب تک لاہور سنٹرل جیل میں مقدّمے کی سماعت جاری رہی میں روزانہ وہاں جاتا رہا ـــ اور مقدّمے کی کارروائی سننے کے ساتھ مولانا کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا اور اُن کے صبر و سکون سے خود اپنے جذبے اور ولولے کے لئے حرارت حاصل کرتا رہا ـ چوہدری نذیر احمد مرحوم کا 'دفاع' میرے اندازے میں اتنا جاندار نہ تھا جتنی توقع تھی ـ جبکہ سرکاری وکیل (غالباً اعوان صاحب) کا آخری جوابی حملہ بہت زوردار تھا ـــ اور میرا دل اُسی وقت ڈوب سا گیا تھا ـ تاہم جب تک فیصلے کا اعلان نہ ہوا ایک اُمّید سی قائم رہی ـــ لیکن جب پھانسی کی سزا کا اعلان ہوا تو اعصاب پر بجلی سی گری اور ایک بار تو دُنیا اندھیر ہو گئی! اس وقت جو کیفیت ہم سب کی تھی وہ ناقابل بیان ہے ـ تاہم مایوسی کے اس غلبے اور رنج و غم کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہم سب کیلئے جو چیز نہایت ہمت افزا اور حد درجہ حوصلہ بخش تھی وہ یہ کہ مولانا نے پھانسی کی سزا کا حکم بھی نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنا اور بعد میں بھی

پھانسی کے سزا یافتہ قیدیوں کے مخصوص کپڑے پہننے سے لیکر کال کوٹھڑی میں داخل کئے جانے اور وہاں موت کے انتظار کے صبر آزما لمحات میں کسی بھی مرحلے پر اُن کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

میں ان دنوں لاہور سے جمعیت کے زیر اہتمام پندرہ روزہ 'عزم' شائع کیا کرتا تھا جس کی ادارت کے فرائض میں اور ڈاکٹر سید اسلم (حال اسسٹنٹ پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو ویسکلر ڈیزیز، کراچی) مشترکہ طور پر سرانجام دیتے تھے۔ میں نے اس موقع پر اس میں ایک تو حضرت جگر مراد آبادی کی وہ غزل شائع کی جو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ خاص اسی موقع کے لئے کہی گئی تھی ؎

یہ صحن و روش یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا۔ لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

اور ؎ جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

اور دوسرے جناب رئیس امروہوی کا ایک قطعہ بھی جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا تھوڑے سے تصرف کے ساتھ شائع کیا: ؎

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے،
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی، فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے!
رئیس اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے ہو آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

اس کے آخری شعر کو میں نے 'رئیس' کی زیر کے ساتھ شائع کیا۔

گویا مصرعہ یوں بن گیا کہ ع "رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں!" اور اس طرح یہ تحریک کے ایک ادنیٰ کارکن کی جانب سے پیغام بن گیا تحریکِ اسلامی کے قائد و رئیس کے نام!!

بہرحال خدا خدا کر کے رنج و غم کے یہ بادل چھٹے، مولانا کی سزا میں تخفیف ہوئی اور اگرچہ طویل اسیری کی جدائی کا خیال سوہانِ روح تھا تاہم یہ اطمینان ہو گیا کہ ــــ یار زندہ صحبت باقی!

دوسری جانب ۵۳ء ہی میں پاکستان کے طول و عرض میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل طلباء نے سر اٹھایا اور ایک ملک گیر تحریک شروع کر دی جس کا عنوان تھا: 'طلباء کے مسائل اور مشکلات'، اس تحریک کا اصل مرکز کراچی تھا اور وہاں ان عناصر نے تقریباً تمام کالجوں کی یونینوں پر قبضہ کر کے ایک 'بین الکلیاتی ادارہ' INTERCOLLEGIATE BODY کے نام سے قائم کیا جس کا مخفف I.C.B. تھا اور طلباء کے مسائل اور مشکلات کے حوالے سے بھرپور ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اُس وقت کی کراچی جمعیت کی قیادت نے اس صورتِ حال سے بایں طور عہدہ برآ ہونے کی سعی کی کہ اپنے پرچے 'اسٹوڈنٹس وائس' (STUDENTS VOICE) کو طلباء کے کاز کا سب سے بڑا علمبردار (CHAMPION) بنا دیا جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لیکن جب ایجی ٹیشن کی آگ پوری طرح بھڑکی تو معلوم ہوا کہ اس کی قیادت میں جمعیت کا کوئی حصہ نہیں ہے ــــ بلکہ قیادت کُل کی کُل I.C.B کے ہاتھ میں ہے ــــ میں لاہور میں بیٹھا اس صورتِ حال کو سخت پریشانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن چونکہ جمعیت کے وسائل ان دنوں بہت محدود تھے اور ہوائی سفر تو بالکل ہی خارج از بحث تھا۔ لہٰذا اس کے باوجود کہ ناظم اعلےٰ میں تھا اور میرے نزدیک جمعیت کراچی کی یہ روش سخت غلط تھی تاہم میں بالکل اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہ تھا ــــ اُن دنوں میں بارہا مولانا کی خدمت میں خاص اس مسئلے میں رہنمائی

حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ۔ تو اگرچہ وہ خود اپنے معاملات اور اینٹی قادیانی تحریک سے پیدا شدہ مسائل میں بہت الجھے ہوئے تھے تاہم میری باتیں پوری توجہ اور غور سے سنتے اور میرے ساتھ اتفاق رائے کا اظہار فرماتے، لیکن ایک تو خود اپنی مصروفیات اور پریشانیوں کے باعث اور دوسرے اس بنا پر کہ جمعیت قانوناً جماعت کے تابع نہ تھی اس ضمن میں اثر انداز ہونے سے معذوری کا اظہار فرماتے ۔

تاہم جب کراچی کے قائدین کراچی میں اپنی فتح کے جھنڈے لہراتے عازمِ پنجاب ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر ملتان ہی میں اُن کا بھرپور 'خیر مقدم' کیا ۔ اور پھر لاہور، لائلپور (حال فیصل آباد) اور راولپنڈی ہر جگہ ان کا پیچھا کر کے اُن کی مہم کو بالکل ناکام بنا دیا ۔ اگرچہ لاہور کے بعض طلباء کی جانب سے مجھے قتل کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں ۔ اور خود جمعیتِ لاہور کے بعض عناصر بھی میرے اس طرزِ عمل کے مخالف رہے ۔ لیکن الحمد للہ کہ مولانا مودودی نے میرے اس طرزِ عمل سے پورا اتفاق فرمایا اس پر ہر طرح صاد کیا ۔ اور وہ میری ہر طرح سے ہمت افزائی فرماتے رہے تا آنکہ وہ خود اُس مخمصے میں گرفتار ہو گئے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔

تاہم اس مسئلے پر میرے اور کراچی جمعیت کی اُس وقت کی قیادت کے درمیان شدید اختلافِ رائے پیدا ہو گیا جس میں بعد میں بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئیں اور خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی ۔ نتیجۃً میں نے دورانِ سال ہی جمعیت کی نظامتِ علیا کی ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کر لی اور آئندہ سالانہ اجتماع تک کے لئے ایک 'قائم مقام ناظمِ اعلیٰ' کا تقرر کر دیا ۔ اور آئندہ سالانہ اجتماع کے موقع پر جو نومبر ۵۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا، جہانگیر پارک میں منعقدہ ایک جلسۂ عام میں زیر صدارت ڈاکٹر عمر حیات ملک مرحوم ایک مفصل تقریر (جو ایک گھنٹہ چالیس منٹ پر پھیلی ہوئی تھی) "طلباء کے مسائل اور اُن کا حل،، ہی کے موضوع پر کی جس میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا ۔

اس تقریر کے بارے میں جو انتہائی تحسین آمیز جملے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہے وہ برادرم ظفر اسحٰق انصاری نے "اسٹوڈنٹس وائس" میں شائع شدہ رپورٹ میں درج کر دیئے تھے — لیکن میرے لئے سب سے بڑھ کر مسرت بخش اور حوصلہ افزا واقعہ یہ تھا کہ جیسے ہی میں تقریر ختم کر کے ڈائس سے نیچے اُترا ایک عمر رسیدہ سفید ریش بزرگ نے دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا اور فرمایا: "جتنی دیر تم وہاں کھڑے تقریر کرتے رہے میں وہاں تمہاری بجائے مولانا مودودی کو دیکھتا رہا!" کافی دیر تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھنے کے بعد جب انہوں نے مجھے علیحدہ ہونے کی اجازت دی تو میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جن سے اُن کی داڑھی بھیگ گئی تھی — اُن آنسوؤں میں غالباً مولانا مودودی کی اسیری کا غم بھی شامل تھا — اور اس بات کی خوشی بھی کہ جو شمع انہوں نے روشن کی ہے اُس کی روشنی میں قدم آگے بڑھانے والے بہت سے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں — یعنی ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں!

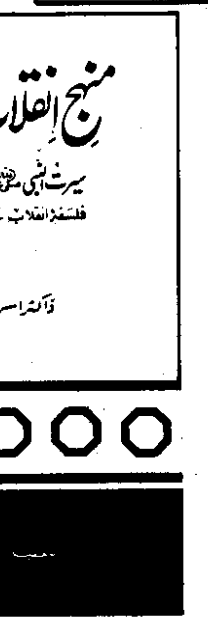

اشاعتِ خاص -/۱۶ روپے، عام -/۷ روپے

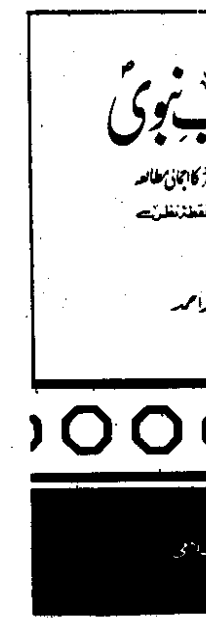

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

'یادِ یارِ مہرباں آید ہمے'

دس سال پیشتر تحریر کردہ نامکمل مضمون 'مولانا مودودی مرحوم اور میں' کے تکملہ کا ابتدائی حصّہ

جو ۲۲ر ستمبر ۹۲ء کو سپردِ قلم کیا گیا

آج ۲۲ر ستمبر ۱۹۹۲ء ہے۔ گویا مولانا مودودی مرحوم کو اس جہانِ فانی سے دارالخلد منتقل ہوئے پورے تیرہ برس بیت چکے ہیں۔

میں نے ان کے انتقال کے لگ بھگ تین برس بعد اپنے پہلے سفرِ امریکہ کے موقع پر مولانا سے ملاقات کی شدید خواہش، لیکن ان کے اچانک انتقال کے باعث ۲۲ر ستمبر ۷۹ء کو بفلو میں ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے مکان پر مولانا کے صرف جسدِ خاکی کی زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی ایک تأثراتی روداد تحریر کی تھی جو ستمبر ۸۲ء کے "میثاق" میں شائع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد۔ "تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!" کے مصداق مولانا کے ساتھ اپنے ذاتی ربط و تعلق کی داستان لکھنی شروع کی تھی جس کی قسطِ اول میں ۴۶-۴۵ء سے ۵۳ء تک کے حالات و واقعات کا اجمالی خاکہ آگیا تھا۔ یہ قسط بھی اکتوبر ۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے بعد قلم پر سخت گرہ لگ گئی جو پورے دس سال لگی رہی۔

چند روز قبل ماہ ستمبر کی مناسبت سے ع "یادِ یارِ مہرباں آید ہمے!" کے مطابق پھر کچھ "داغ ہائے سینہ" تازہ ہوگئے اور ارادہ ہوا کہ اس "آخر" اور "اول" کے مابین خَلا کو، خواہ اختصار کے ساتھ ہی سہی، کسی طور پاٹ دیا جائے۔ تو پہلے تو خوف سا محسوس ہوا کہ ۵۳ء سے ۷۹ء تک چھبیس (۲۶) برس پر پھیلی ہوئی داستان، اور

وہ بھی اب جبکہ اس کے خاتمے کو بھی تیرہ برس بیت چکے' کیسے لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن پھر ایک تو یہ خیال آیا کہ اب سے چار سال قبل مولانا مرحوم کے ساتھ اپنے ذہنی اور قلبی تعلق کے نشیب و فراز کا ایک مختصر خاکہ قلم سے "صادر" ہو کر میثاق ستمبر ۸۸ء میں شائع ہو گیا تھا۔ اب اگر اسے سامنے رکھ کر اس میں کچھ معین واقعات کا رنگ بھر دیا جائے تو کام زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اور دوسرے دو روز قبل جب ہفت روزہ "تکبیر" کراچی کا شمارہ مورخہ ۲۴ ستمبر ۹۲ء اور اس سے قبل کا شمارہ (مورخہ ۱۷ ستمبر ۹۲ء) نظر سے گذرا تو احساس ہوا کہ ع "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!" کے مصداق یہ تاخیر بھی حکمت و مشیّتِ خداوندی سے ہوئی ہے! اور غالباً اس داستان کی تکمیل کا موزوں ترین وقت یہی ہے۔ چنانچہ اللہ کے بھروسے پر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ السّعی منّی والاِتمام من اللہ!

اب سب سے پہلے مناسب ہے کہ ۸۸ء کا تحریر کردہ متذکرہ بالا خاکہ (شائع شدہ میثاق ستمبر ۸۸ء) سامنے آجائے۔ اس کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ میں وسط اکتوبر ۷۰ء تا وسط فروری ۷۱ء پاکستان سے باہر رہا تھا۔ یہ عام حساب سے چار ماہ بنتے ہیں' اور تبلیغی بھائیوں کے حساب سے "تین چلّے"۔ ان میں پورا ماہ رمضان المبارک بھی شامل تھا جو میں نے مدینہ منوّرہ میں بسر کیا تھا۔ بعد ازاں ایک ماہ کے لئے برادر عزیز ابصار احمد کی دعوت پر انگلستان چلا گیا تھا۔ وہ ریڈنگ یونیورسٹی سے 'ایم فل' کرنے کے بعد اُن دنوں لندن یونیورسٹی میں 'پی ایچ ڈی' کی تکمیل کر رہے تھے۔ وہاں سے پھر واپسی حجازِ مقدّس ہی ہوئی' جہاں حج کی سعادت حاصل کی۔ ذیل کا اقتباس لندن سے حجاز واپسی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے:

"واپس سعودی عرب پہنچا تو یہ غالباً جنوری ۷۱ء کی اٹھارہ تاریخ تھی اور اتفاقاً جدّہ ہی میں راؤ محمد اختر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے مدینہ منورہ کی عید الفطر کے دن والی ملاقات کے بعد پہلی بار ملنا ہوا تھا۔ پاکستان

کے عام انتخابات کے نتائج کی بنا پر وہ نہایت پژمردہ اور مضمحل تھے' میں نے لوہا گرم سمجھ کر کہا: "راؤ صاحب! کیا اب بھی آپ لوگ اپنے اندازوں اور طریق کار پر نظرثانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے؟" --- تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے تڑخ کر جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب! اب تو اگر خود مولانا مودودی بھی طریق کار کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے' تو ہم انہیں بھی ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے!" --- مجھے اُس وقت تو ان کی بات ایک "جذباتی طوفان" (EMOTIONAL OUTBURST) کا مظہر نظر آئی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ فی الواقع جماعت کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ذہن اور مزاج کی صحیح عکاسی تھی!۔

مکہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ ادا کیا --- تو وہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے ملاقات ہوئی' انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس مولانا مودودی کی اُس تقریر کا ٹیپ پہنچ گیا ہے جو انہوں نے لاہور کے ایک اجتماعِ کارکنان میں انتخابات میں جماعت کی بری طرح ناکامی پر جماعت ہی کے حلقے کے بعض صحافیوں کی نکتہ چینیوں کے جواب میں کی تھی۔ (واضح رہے کہ یہ وہی صحافی تھے جو انتخابات سے قبل جماعت اسلامی کی شاندار متوقع کامیابی کے ضمن میں مبالغہ آمیز اندازے شائع کرتے رہے تھے' لیکن اب جبکہ نتیجہ برعکس نکل آیا تھا تو جماعت کی بعض حکمت عملیوں اور بالخصوص طریقِ تنظیم کو ہدفِ تنقید بنا رہے تھے!)۔ چنانچہ میں نے ان کے مکان پر حاضر ہو کر اس تقریر کا ریکارڈ سنا تو مجھے بالکل ایسے محسوس ہوا کہ جیسے مولانا کسی جیوری کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہو کر صفائی پیش فرما رہے ہوں۔ چنانچہ اس پر میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے --- کہ اللہ اکبر کس قدر دردناک اور حسرتناک معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی دعوت و خدمتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں صَرف کردی' اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

بلامبالغہ لاکھوں انسانوں کو متأثر کیا--- اور ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے انہیں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کا سپاہی بنادیا' عمر کے آخری حصے میں اپنے ہی عقیدت مندوں کے حلقے سے تعلق رکھنے والے--- اور اپنے بیٹوں کی عمر کے نوخیز و نومشق صحافیوں کے سامنے اپنے بعض اساسی نظریات' بالخصوص ہیئتِ تنظیمی کا دفاع کرنے پر مجبور ہوگیا ہے--- **فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَار!**

بہرحال اواخر جنوری ۷۱ء کی کسی تاریخ کو مکہ مکرمہ میں زبیر عمر صدیقی صاحب کے مکان پر جو چند آنسو میری آنکھوں میں بے اختیار اُمڈ آئے تھے انہوں نے میرے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا جو ۱۹۶۲ء کے بعد سے مولانا مودودی کے ساتھ کدورت کی بنا پر جمع ہونا شروع ہوگیا تھا۔

تفصیل اِس اِجمال کی یہ ہے--- کہ مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرا تعلّق اتار چڑھاؤ کے متعدّد ادوار سے گزرا ہے' اور ان کے بارے میں میرے احساسات اور قلبی کیفیات میں کئی بار تغیر و تبدّل ہوا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک یعنی پندرہ سے اکیس برس عمر کے دوران انکے ساتھ میرا تعلق غایت درجہ محبت اور احترام ہی کا نہیں' انتہائی عقیدت کا بھی تھا۔ اور میں اپنے چھوٹے سے ذہن اور محدود معلومات کی بناپر انہیں نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد اُمّتِ مسلمہ کا عظیم ترین فرد سمجھتا رہا۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار اِدھر لاہور اور پنجاب میں تحریکِ ختم نبوت کے ضمن میں جماعت اسلامی کے رول اور اُدھر کراچی میں طلبہ کی کمیونسٹ تحریک کے ضمن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رول سے میرے ذہن میں اولین شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں

اس اختلافی سوچ کا آغاز ہوا جو ۵۶-۵۵ء تک اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی اور نومبر ۵۶ء میں اُس اختلافی بیان کی صورت میں ضبطِ تحریر میں بھی آگئی جو پورے دس سال بعد (۱۹۶۶ء میں) " تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ " کے نام سے شائع ہوا ـــــ اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ عقیدت کا تو خاتمہ ہوگیا' تاہم محبت اور احسان مندی کا جذبہ برقرار رہا۔

۳۔ ۵۶ء سے اپریل ۵۷ء تک مولانا مرحوم کے بعض اقدامات کی بنا پر ان کے ساتھ حسنِ ظن کو شدید صدمہ پہنچا ـــــ لیکن اس کے باوجود ایک گونہ دلی تعلق بھی برقرار رہا ـــــ اور احسان مندی کے جذبات میں بھی کوئی کمی نہیں آئی ـــــ اور اپریل ۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد سے اپریل ۷۲ء تک یہ کیفیت علیٰ حالہٖ برقرار رہی ۔ چنانچہ ابتداء میں تو میں ملاقات کے لئے بھی حاضر ہوتا رہا اور اگرچہ یہ محسوس کرکے کہ مولانا بھی میری آمد سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے اور ۵۔ اے ذیلدار پارک کی عمومی فضا میں تو بہت ہی ناگواری پائی جاتی ہے ' یہاں تک کہ بعض لوگوں کے چہرے تو ہو بہو " تَعرِفُ فِی وُجُوهِهِمُ المُنكَر " کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں ' میں نے آمدو رفت تو بند کردی ـــــ تاہم مولانا سے کوئی قلبی بُعد پیدا نہیں ہوا اور احسان مندی کے جذبات توجوں کے توں قائم رہے ـــــ چنانچہ اپریل ۷۲ء میں حج کے لئے روانگی سے قبل میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ: " مولانا! میں حج کے لئے جارہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اگرچہ جماعت کی پالیسی سے میرا اختلاف نہ صرف علیٰ حالہٖ قائم ہے بلکہ شدید تر ہوگیا ہے ـــــ لیکن میرے دل میں آپ کی جانب سے کوئی کدورت نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں میری جانب سے کوئی مَیل ہو تو آپ بھی اسے صاف فرمالیں! " ـــــ اس پر مولانا نے بڑے اطمینان اور انشراح کے ساتھ فرمایا: " آپ بالکل مطمئن رہیں ' میرے دل میں آپ کی جانب سے ہرگز کوئی میل نہیں ہے! " ـــــ یہی وجہ ہے کہ جب میری روانگی کے بعد دفعۃً مولانا کو

سعودی حکومت کی جانب سے " رابطۂ عالمِ اسلامی" کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اور چند روز بعد وہ بھی حجازِ مقدس پہنچ گئے تو میں نے ان سے متعدد بار مکہ مکرمہ میں فُندق مصر میں ملاقات بھی کی اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں کچھ گفتگو بھی کرنی چاہی۔ اگرچہ اس کا جواب مجھے بہت حوصلہ شکن ملا۔

۴۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ایک جانب جمہوریت کے عشق میں جس انتہا پسندی کا ثبوت دیا کہ نہ صرف یہ کہ خالص سیکولر بلکہ ملحد عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی ' اور مبالغہ آرائی اس حد تک پہنچ گئی کہ صدر ایوب خان بمقابلہ محترمہ فاطمہ جناح کے باب میں یہ الفاظ تک کہہ دیئے گئے کہ: " ایک جانب ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے' اور دوسری جانب ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے!"—— اور دوسری طرف عوامی توجہ کا مرکز بننے کے لئے دینی اعتبار سے اس درجہ پستی اختیار کر لی گئی کہ "غلافِ کعبہ کی رام لیلا" منعقد کرنے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہ کیا—— وغیرذالک —— تو ' مجھے اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ ' میرے دل میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ یہاں تک کہ احسان مندی کے جذبات بھی اس منفی جذبے کے نیچے دب کر رہ گئے—— یہی سبب ہے کہ میری ۶۶ء تا ۷۰ء کی تحریروں میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے!

۵۔ اور یہی وہ کیفیت تھی جس میں ایک اچانک انقلاب اواخرِ جنوری ۷۱ء کی اُس شام کو مکہ مکرمہ میں آیا ' جس کا تذکرہ پہلے ہوچکا ہے اور جس کے نتیجے میں نفرت کی جگہ تأسّف آمیز حسرت نے لے لی ' اور اگرچہ اختلاف پوری شدت کے ساتھ قائم رہا —— تاہم قلب کی گہرائیوں سے ذاتی احسان مندی کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا جو بحمد اللہ آج تک برقرار ہے!

۶۔ لیکن اس کے بعد بھی مولانا سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی۔ اس لئے کہ ایک تو اس طویل عرصے کے دوران بہت سے اسباب کی بناء پر' اور بالخصوص میری اپنی بعض تحریروں کے باعث حجابات بہت گہرے ہو چکے تھے ـــــ دوسرے پالیسی کا اختلاف جوں کا توں برقرار تھا ـــــ اور یہ بات میرے علم میں بہت دیر کے بعد آئی کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی شکست کے بعد مولانا اپنی بعد از تقسیم ہند پالیسی سے مایوس ہوگئے تھے اور تہہ دل سے چاہتے تھے کہ اسے تبدیل کردیا جائے۔ لیکن اب کچھ اپنی ضعیفی اور علالت' اور کچھ جماعت کے کارکنوں' اور بالخصوص اس کی نئی قیادت کے مزاج میں سیاسی رنگ کے پختہ ہوجانے کے باعث وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے ـــــ بہرحال' جب میرے علم میں یہ حقائق آئے تو فطری طور پر دل میں ملاقات کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن جن ذرائع سے مولانا کے نقطۂ نظر کی تبدیلی کا علم حاصل ہوا تھا ان ہی کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان کے گرد جماعت کا حفاظتی حصار بہت سخت ہے' اور اول تو ان سے میری ملاقات ہی محال کی حد تک مشکل ہے' ثانیاً اس کی توقع بہت کم ہے کہ مولانا کھل کر بات کرسکیں۔ لہٰذا اس "سعیِ لا حاصل" کا ارادہ ترک کردیا۔

۷۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اگست میں امریکہ سے ایک زور دار دعوت موصول ہوئی اور میں نے اسے قبول کرلیا تو اس خیال کے تحت کہ مولانا بھی آج کل وہیں مقیم ہیں دل میں دبی ہوئی خواہش کی چنگاری بھڑک اٹھی اور پختہ ارادہ کرلیا کہ وہاں ملاقات ضرور کروں گا ـــــ لیکن افسوس کہ جیسے ہی میں امریکہ پہنچا' مولانا شدید علیل ہوگئے' اور شدید خواہش کے باوجود ان سے زندگی میں ملاقات نہ ہوسکی۔ بلکہ صرف ان کے مردہ جسدِ خاکی کی زیارت اور نماز جنازہ میں شرکت نصیب ہوسکی ـــــ اور اس موقع پر مولانا کے صاحب زادے ڈاکٹر احمد فاروق کے اِس جملے نے میری حسرت کو وہ چند کردیا کہ "ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہش مند تھے' لیکن ان کے

معالجین کی سخت ہدایت تھی کہ ان سے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے سوا اور کوئی نہ ملنے پائے!"

اِس خاکے کی شِق نمبر۷ کی تفصیل میری سولہ صفحات سے زائد پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں موجود ہے جو ستمبر ۸۲ء کے "میثاق" میں شائع ہوئی تھی' اور شق نمبر۱ کی بیس صفحات سے زائد پر مشتمل تفصیل اکتوبر ۸۲ء کے میثاق میں شائع ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب جس خَلا کو پر کرنا مطلوب ہے اس کے لئے اوپر اوّل اور آخر کی بجائے آخر اور اوّل کے درمیان کے خَلا کے الفاظ استعمال ہوئے۔ اب ذیل میں درمیان کی پانچ شِقوں کے ضمن میں یہ سلسلہ وار گذارشات پیش ہیں۔

شِق نمبر۲ کے ضمن میں جہاں تک ۵۳ء کی ختمِ نبوّت تحریک میں جماعت اسلامی کے رول کا تعلق ہے اُس وقت میں نے یہ تو ضرور محسوس کر لیا تھا کہ وہ جماعت کے سابق اصولی موقف سے مطابقت نہیں رکھتا اور صرف وقتی سیاسی دباؤ کا نتیجہ ہے لیکن اس وقت تک میرا تجزیہ اس سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ مزید برآں میں اُس وقت جماعت کے اندرونی حالات سے بھی قطعاً واقفیت نہیں رکھتا تھا' اس لئے کہ میں پورے پانچ سال سے کلّیۃً اسلامی جمعیت طلبہ ہی کے حلقے میں مصروف و مشغول تھا۔ یہ راز کہ جماعت اسلامی کے اخلاقی زوال کا آغاز ہوچکا ہے مجھ پر دو سال بعد ۵۵ء میں کھلا جب میں جماعت اسلامی کا رُکن بن کر جماعت کے حلقہ اوکاڑہ کے نظم سے وابستہ ہوا۔ البتہ جہاں تک اسلامی جمعیت طلبہ کی کراچی کی قیادت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں مجھے اُسی وقت شدید تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ اور اس کے جس کردار اور رویّہ کا مظاہرہ میرے علم میں ۵۳ء کے جمعیت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر آیا تھا شاید اس کی وضاحت اور صراحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آج ہی کا وقت طے کیا ہوا تھا اور اسی لئے آج سے دس سال قبل میرے قلم پر گرہ لگادی تھی جو اب کھلی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ اکتوبر ۸۲ء کے "میثاق"

میں شائع ہونے والی قسطِ دوم ٹھیک اسی مقام پر آکر ختم ہوئی تھی کہ ۵۳ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی کے جلسۂ عام کا ذکر تو ہوگیا تھا لیکن تنظیمی امور بیان نہیں ہوئے تھے۔

اس لئے کہ ہفت روزہ تکبیر کی ۱۷ر اور ۲۴ر ستمبر ۹۲ء کی اشاعتوں میں میاں طفیل محمد' جناب نعیم صدّیقی' اور چودھری نذیر احمد کی تحریروں سے جماعت کے موجودہ خلفشار کی جو تصویر سامنے آتی ہے اور جماعت کے قدیم ترین " السابقون الاولون " کے "بقیۃ الثّمان" اور مولانا مودودی مرحوم کے قریب ترین ساتھیوں کا جو حال نظر آتا ہے کہ وہ ع "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا!" سے گزر کر۔ " دشنام' نالہ' ہاو ہو' فریاد کچھ تو ہو۔ چٹخے ہے درد اے دلِ برباد کچھ تو ہو" کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں' یہ سب ایک "قبضہ گروپ" کی کارستانیوں کا مظہر ہے جو جماعت کی قیادت پر قابض ہوگیا ہے۔

جماعت کی قیادت کے اس "قبضہ گروپ" کا آغاز کب اور کس کے زیر اثر ہوا تھا ـــــ اور وہ اب جماعت پر کس طور سے "قابض" ہے' اس کی وضاحت ـــــ اور مولانا مودودی مرحوم سے میرے رابطہ کی بقیہ داستان اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ـــــ سردست ہفت روزہ تکبیر کراچی کی ۱۷ر اور ۲۴ر ستمبر کی اشاعتوں سے میاں طفیل محمد' جناب نعیم صدیقی اور چوہدری نذیر احمد (سابق امیرِ جماعت ضلع اوکاڑہ) کے بیانات کے علاوہ جماعت کے حالیہ بحران کے ضمن میں "تکبیر" کے وقائع و تجزیہ نگار جناب نصراللہ خلزئی کی تحریر سے اندازہ لگائیں کہ اس "قبضہ گروپ" نے جماعت کو کس طرح اس حال تک پہنچادیا کہ ع

"کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!"

ضمیمہ

جماعتِ اسلامی کے حالیہ بحران کی نوعیت اور شدّت

بعض اکابرینِ جماعت کے خیالات و بیانات کے آئینے میں

(بشکریہ ہفت روزہ "تعمیر" کراچی)

○

میاں طفیل محمد صاحب کا خط، ارکانِ شوریٰ کے نام

○

جماعت کی مرکزی شوریٰ سے میاں طفیل محمد صاحب کا استعفاء!

شریعت بل، خلیج کی جنگ اور "پاسبان" پر
امیرِ جماعت سے شدید اختلافات

○

"جماعتِ اسلامی کی پٹڑی بدل دی گئی ہے"

جناب نعیم صدیقی کا انٹرویو

میاں طفیل محمدؒ سابق امیرِ جماعت اسلامی کا خط بنام

مرکزی مجلسِ شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان

محترم ارکان مرکزی مجلسِ شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

پاکستان میں شریعت کو ملک کا بالا تر قانون بنانے کے لئے جو شریعت ایکٹ ہماری پارلیمنٹ نے پاس کیا تھا' اس کے متعلق میری جو رائے تھی وہ میں نے اس کے بعد منعقد ہونے والے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بھی بیان کر دی تھی اور اسے میں نے موچی دروازہ کے باہر جماعت کے یوم تاسیس پر اس کی پچاس سالہ تقریبات کے سلسلے میں جو عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا تھا' اس میں سرعام بھی ظاہر کردیا تھا۔ مجھے اپنی اس رائے کے بارے میں کبھی کوئی شک یا ذرا سا تردد بھی محسوس نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص شریعتِ الٰہی کے کسی ایک صریح اور قطعی حکم کا انکار یا اسے رد کر کے اسلام کے دائرے کے اندر رہ جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایسا کوئی شخص اقامتِ دین کی علمبردار کسی جماعت میں شامل اور اس کی نمائندگی اور رہنمائی کے منصب پر فائز ہو سکے۔ کس قدر عجیب ہے یہ بات کہ یہ قانون بنانے والے لوگ' تحریک اور جماعت اسلامی میں بدستور شامل ہی نہیں' اس کے اندر مختلف مناصب پر فائز بھی ہیں۔ امیر جماعت نے تو اس سے پہلے بھی بار بار مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور شائع شدہ قراردادوں کی کھلی اور علانیہ خلاف ورزی کی ہے' لیکن ہر بار مجلس شوریٰ نے اپنا فرض کما حقہٗ ادا کرنے کی بجائے اندرونِ خانہ ہی کچھ باتیں کرکے معاملہ کو دفن کردیا' اس ڈھیل کا نتیجہ ہے کہ نوبت کفرِ بواح تک پہنچ گئی اور جماعت کی دینی بصیرت ساری دنیا کے سامنے کھل کر آگئی ہے۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ جس گروہ اور جن لوگوں کو اس بارے میں سب سے زیادہ حساس ہونا چاہئے تھا' یعنی تحریک اور جماعت اسلامی کے لوگ' وہی توجہ دلانے کے باوجود سر تا سر کوتاہ ثابت ہوئے۔ حالانکہ دوسرے ارکان اسمبلی و سینیٹ ہمارے امیر اور نائب امیر اور ارکان اسمبلی کے اس قانون کی تائید و حمایت کرنے کو ہی اس کے اسلامی اور ناقابل اعتراض ہونے کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ہمارے یہ رہنما

کسی پشیمانی کا اظہار کرنے کے بجائے الٹا اس شریعت ایکٹ کی وکالت اور اس کی حمایت میں دلائل پیش فرمارہے ہیں اور اس کے خلاف کوئی بات سامنے آنے سے روک رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد یعقوب صاحب رکن صوبائی اسمبلی سرحد اور مولانا گوہر الرحمان کے مضامین عرصہ سے ترجمان القرآن کے کولڈاسٹوریج میں یخ بستہ دھرے ہیں اور مولانا مودودیؒ کے جانشین ان کے رسالہ ترجمان القرآن میں اس کافرانہ قانون کے فضائل و مناقب بیان فرمارہے ہیں۔ اب شریعت کورٹ کے فل بنچ کے اس شریعت ایکٹ کی حقیقت اور اس کے بنانے والوں کی دینی حیثیت واضح کردینے کے بعد بھی اگر جماعت اسلامی اور اس کی مجلس شوریٰ حرکت میں نہیں آتی ہیں' تو پھر یہ وہ جماعت تو نہیں ہے جو اگست ۱۹۴۱ء میں بنائی گئی تھی' چالیس برس تک کام کرتی رہی اور جس میں ہم لوگ شریک ہوئے تھے۔ جہاں صریحًا غلط اور منافیٔ دین و شریعت کاموں پر گرفت اور احساسِ ندامت کے برعکس ان کو صحیح اور مفید ثابت کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کیا جانے لگے وہاں اصلاحِ احوال کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

ان حالات میں مجلس شوریٰ کے ارکان کا فرض ہے کہ وہ اپنے حلف کو سامنے رکھ کر اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔

شریعت کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد ملک اور اور اس کے آئین کے محافظوں کا بھی فرض ہے کہ ہر صاحبِ اختیار اسلامی جمہوریہ پاکستان سے وفاداری کے اپنے حلف سے عائد ہونے والی اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اپنے ملک وملت کے مسلّمہ مقتدرِ اعلیٰ اللہ رب العالمین سے وفاداری اور اس کی حدود کے تحفظ کا حق ادا کرے اور جن لوگوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے انتظامی' سیاسی' اقتصادی' عائلی اور قانون سازی گویا تمام ہی دائرہ ہائے زندگی سے شریعت کو بے دخل کر کے اللہ رب العالمین سے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے' ان کو کم سے کم سزا یہ دی جائے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی نمائندگی کے نا اہل قرار دے کر پالیمنٹ (قومی اسمبلی اور سینیٹ دونوں) سے الگ کر کے انہیں اپنے گھروں کو بھیج دیا جائے ---'ہذا ما عندی والعلم عند اللہ۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

خاکسار

طفیل محمد

۶۔ سی' منصورہ' ملتان روڈ' لاہور

جماعت کی مرکزی شوریٰ سے میاں طفیل محمد کا استعفاء اور شریعت بل، خلیج کی جنگ اور "پاسبان" پر امیر جماعت سے شدید اختلافات

(از قلم: نصراللہ غلزئی، نمائندہ ہفت روزہ "تکبیر")

جماعت اسلامی پاکستان کے تاسیسی رکن اور بانیٔ جماعت سید ابو الاعلیٰ مودودی کے جانشین میاں طفیل محمد نے جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ چونکہ استعفیٰ ایک ماہ تک گہرے غور و فکر کے بعد دیا گیا، اس لئے اسے واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ میاں طفیل محمد صاحب نے قبل ازیں خلیج کی جنگ کے موقع پر قاضی حسین احمد کی پالیسیوں کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے اپنا استعفیٰ پیش کیا تھا، لیکن جماعت اسلامی کے بعض ذمہ دار افراد کے کہنے سننے پر واپس لے لیا تھا۔ تاہم اس مرتبہ میاں طفیل محمد کے ساتھ صوبائی شوریٰ کے ایک رکن اور امیر ضلع اوکاڑہ نذیر احمد نے بھی اپنا استعفیٰ امیر جماعت اسلامی پنجاب کو بھجوادیا ہے۔ بلکہ انہوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا ہے کہ "مجھے آج سے ہی اپنے عہدہ سے علیحدہ تصور کریں"۔ اس کے علاوہ انہوں نے قاضی حسین احمد صاحب کو ایک خط بھی تحریر کیا ہے۔ استعفے و خط من و عن شائع کئے جارہے ہیں۔

یہ دو استعفے محض دو افراد کے نہیں، بلکہ دیگر بہت سے اصحاب بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہے ہیں، اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ متعدد ارکان انتخابِ امیر اور "پاسبان" کے معاملات کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے مجلس شوریٰ کا اجلاس بلانے کی درخواست دینے پر بھی غور کررہے ہیں۔ ایک رکن کے بقول اگر آپریشن کا مرحلہ درپیش نہ ہوتا تو اب تک غالباً یہ درخواست دی جاچکی ہوتی۔

میاں طفیل محمد نے راقم الحروف سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ: "سرکاری شریعت بل" کی حمایت کرنے پر حکومت اور جماعت اسلامی کی قیادت سے انہیں سخت صدمہ ہوا ہے، اپنی رائے ہی نہیں اپنے جذبات کا اظہار بھی انہوں نے موچی دروازہ کے اس جلسہ عام میں کردیا تھا، جس کا اہتمام خود جماعت اسلامی نے کیا تھا۔ انہوں نے "شریعت بل" کو "انسداد شریعت بل" کا نام دے کر کہا تھا کہ اس قانون کے نفاذ سے پاکستان میں اتنی شریعت بھی نافذ

نہیں ہو سکتی جتنی کہ غیر مسلم ہندوستان میں ہے، جہاں مسلمانوں کا "پرسنل لاء" وہاں کے تمام ریاستی و دیگر قوانین کی دست برد سے محفوظ تو ہے، لیکن پاکستان میں اس شریعت بل کے ذریعے "پرسنل لاء" کو یہاں بھی نفاذ شریعت کے دائرہ سے خارج کر دیا گیا ہے۔ تمام سیاسی، اقتصادی معاملات، مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں بھی "شریعت بل" کے دائرے سے باہر رکھی گئی ہیں۔ جماعت اسلامی کے ارکانِ قومی اسمبلی اور امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد اور نائب امیر جماعت اسلامی پروفیسر خورشید احمد نے اس بل کی سینیٹ میں تائید کی۔ میاں طفیل محمد کی رائے میں اس کے بعد یہ تمام اصحاب جماعت اسلامی کے عہدیدار تو کجا رکنیت کے اہل بھی نہیں رہے تھے۔ لیکن جب ارکانِ شوریٰ کی طرف سے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی، تو انہوں نے ارکان شوریٰ کو ایک خط تحریر کیا، جس کی تفصیلات الگ سے دی جا رہی ہیں۔ میاں صاحب نے اپنی رائے کو جماعت اسلامی تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے ذمہ دارانِ حکومت کو بھی اس سے آگاہ کیا، ایک تقریب میں وفاقی وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین کے سامنے بھی انہوں نے یہی اعتراض اٹھایا تھا، لیکن یہ جواب ملنے پر میاں صاحب خاموش ہو جانے پر مجبور ہو گئے کہ "جس شریعت بل کو جماعت اسلامی کے ارکان اور عہدیداروں نے منظور کر لیا تھا، مسلم لیگ کے ارکان اسے منظور کیوں نہ کر لیتے؟"

بالآخر میاں طفیل محمد کی رائے صائب ثابت ہوئی اور شریعت کورٹ نے اس قانون کے خلاف کھلا فیصلہ دے دیا، لیکن "سینیٹ اور اسمبلیوں میں موجود عہدیداروں و ارکان سمیت جماعت اسلامی میں معمولی سی حرکت بھی دیکھنے میں نہ آئی"۔ اس کے بعد میاں صاحب نے یہ مسئلہ جماعت اسلامی کے یوم تاسیس کے موقع پر رکھا اور کہا کہ "جس معاملے میں جماعت اسلامی کو سب سے زیادہ حساس ہونا چاہئے تھا، اسی معاملے میں سب سے زیادہ بے حسی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔" جب شوریٰ کے اجلاس میں یہ معاملہ زیر بحث آیا، تو قاضی صاحب نے جواب میں کہا کہ "میاں نواز شریف نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ ایک نیا قانون منظور کرائیں گے، آئینی ترمیم لائیں گے اور وہ نقائص دور کر دیئے جائیں گے جو منظور شدہ شریعت بل میں موجود ہیں۔" جس پر میاں طفیل محمد نے اپنی شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "میرا یقین ہے کہ اگر کوئی شریعت کا ایک حکم ماننے سے انکار کر دے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، لیکن یہاں تو سب کچھ ہی شریعت کے دائرے سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں مجلس شوریٰ کو سوچنا چاہئے کہ شریعت بل منظور کرنے والوں کو جماعت میں شامل رکھا جائے، چہ جائیکہ انہیں ان کے مناصب اور عہدوں پر بھی فائز رہنے دیا جائے؟" —— انہوں نے یہ بھی کہا کہ "یہ وہ جماعت اسلامی ہی نہیں ہے جس میں ہم شامل ہوئے تھے اور جسے مولانا سید ابوالاعلیٰ

مودودیؒ نے قائم کیا تھا۔" اگرچہ مجلس شوریٰ نے اس صورت حال پر گہری پریشانی کا اظہار کیا تھا' لیکن اس سے زیادہ انہوں نے کچھ نہیں کیا اور "بات وہیں کی وہیں رہی۔"

اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر میاں طفیل محمد نے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا' انہوں نے اپنا استعفیٰ ۱۹ جون ۱۹۹۲ء کو تحریر کر لیا تھا' لیکن مزید غور و خوض کے لئے اپنے پاس رکھ لیا۔ واضح رہے کہ میاں طفیل محمد اس سے قبل بھی ایک مرتبہ شوریٰ سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے' لیکن جماعت کے وسیع تر مفاد میں انہیں استعفیٰ واپس لینے پر آمادہ کر لیا گیا۔ وہ ایک ماہ تک سوچ بچار میں مصروف رہے۔ ان کے بقول' اس تمام عرصے میں "جب بھی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا' میرا ذہن پریشان ہو جاتا' ضمیر اور ایمان ملامت کرتا تھا کہ میں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔"

چنانچہ ۲۰ جولائی ۱۹۹۲ء کو اپنا استعفیٰ قاضی حسین احمد صاحب کے حوالے کر دیا' قاضی صاحب نے اس کے بعد میاں صاحب سے رابطہ کیا اور میاں نواز شریف کی یقین دہانیوں کا اعادہ کیا' لیکن میاں طفیل محمد کا جواب تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ "کوئی شخص چوبیس گھنٹے کے لئے کافر ہو جائے اور پھر ایمان لے آئے۔"

شریعت بل کے معاملے میں میاں طفیل محمد صاحب کو چوہدری شجاعت حسین کے ساتھ گفتگو میں جس طرح خاموش ہونا پڑا کم و بیش وہی کیفیت صدر غلام اسحاق خان کے ساتھ گفتگو میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ صدر غلام اسحاق اور میاں طفیل محمد کے درمیان یہ گفتگو پشاور میں قاضی حسین احمد صاحب کے بیٹے کی تقریب ولیمہ کے موقع پر ہوئی تھی' دوران گفتگو شریعت بل کا ذکر آیا' تو میاں صاحب نے ان سے استفسار کیا کہ "یہ آپ نے کیا کیا کہ ایسے بل پر دستخط کر دیئے ؟" صدر غلام اسحاق خان نے جواب دیا کہ "اس میں میرا کیا قصور ہے ؟ یہ شریعت بل قومی اسمبلی نے منظور کیا' پھر سینیٹ نے اس کی منظوری دی' جس کے بعد وہ میرے پاس بھیج دیا گیا اور میں نے اس پر دستخط کر دیئے' اگر نہ کرتا تو بھی ساتویں دن یہ بل قانونی حیثیت اختیار کر لیتا' ایسی صورت میں تو آپ کو اپنے ارکان اور عہدیداروں سے پوچھنا چاہئے کہ انہوں نے اس بل کی تائید و حمایت کیوں کی۔"

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میاں طفیل محمد صاحب نے قاضی حسین احمد صاحب کو مجلس شوریٰ کی رکنیت سے استعفیٰ بھیج دیا' لیکن قاضی حسین احمد صاحب کی پالیسیوں کے ساتھ اختلافات یہیں پر ختم نہیں ہو گئے۔ میاں صاحب "پاسبان" کے بارے میں انتہائی تشویش میں مبتلا ہیں۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے متعدد ارکان ابھی تک اس امر کی تائید نہیں کرتے کہ "پاسبان" قائم کرنے کی اجازت جماعت کی مجلس شوریٰ نے دی تھی۔ امیر ضلع اوکاڑہ

چوہدری نذیر احمد نے دیگر معاملات کے علاوہ "پاسبان" کا معاملہ بھی اپنے استعفیٰ میں رکھا ہے۔ اور اب تو جماعت اسلامی کی امارت کے لئے امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحب کی جانب سے باقاعدہ "کنوینگ" کرنے کا مسئلہ بھی ارکان شوریٰ کے درمیان بحث و تمحیص کا باعث بن گیا ہے۔ حال ہی میں صوبہ سندھ سے جماعت اسلامی کے ایک نائب امیر نے ایک موقع پر ایک اخبار نویس کے استفسار کے جواب میں کہا: "آپ جماعت اسلامی کی بات نہ کریں' کوئی اور سوال کریں!"۔۔۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ قاضی حسین احمد صاحب "کاروانِ دعوت" کے زیر عنوان کم وبیش ایک سو ارکانِ جماعت کے ہمراہ پورے ملک کا دورہ کریں گے' جہاں وہ ارکانِ جماعت کو اجتماعِ عام میں شرکت کی دعوت دیں گے۔ اس سے قبل منصورہ میں ہونے والے ایک اجتماع میں بعض ارکان نے اپنی تقاریر میں پورے زور سے کہا تھا کہ "قاضی حسین احمد صاحب کو دوبارہ امیر منتخب کیا جائے' اس کے دو سال کے بعد ملک میں اسلامی نظام آجائے گا۔" یہ ارکان مجوزہ دورے میں قاضی صاحب کے ہمراہ ہوں گے۔ میاں طفیل محمد صاحب اور جماعت اسلامی کے بعض دیگر اصحاب کی رائے ہے کہ "جماعت اسلامی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ انتخابِ امیر کے لئے باقاعدہ کنوینگ ہو رہی ہے کہ قاضی صاحب کو دوبارہ امیر منتخب کر لیا جائے۔" کاروانِ دعوت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جماعت اسلامی کے متعدد مرکزی عہدیداروں نے قاضی حسین احمد کی سرگرمیوں کو "انتخابی مہم" ہی قرار دیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق' ایک برس سے بھی پہلے "جسارت" میں شاہد ہاشمی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا' جس میں ارکانِ جماعت سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ قاضی صاحب کو "دوسری ٹرم" کیلئے بھی امیر منتخب کریں۔ اس کے بعد یہ مہم مختلف صورتوں میں شروع ہو گئی۔ "پاسبان" کی سرگرمیوں کو انتخابی مہم سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار نے جنوبی پنجاب کے ارکان سے بار بار کہا ہے کہ انہیں قاضی حسین احمد صاحب کو ہی ووٹ دینا ہوں گے۔ حال ہی میں اسلامی جمعیت طلباء کے بعض افراد کو بھی انتخابی مہم میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ نوجوان دو دو چار کی ٹولیوں کی صورت میں ارکانِ جماعت کے ساتھ رابطے قائم کرتے ہیں' آئندہ انتخابات کے حوالے سے ان کی رائے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر انہیں قاضی حسین احمد صاحب کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لئے اپیل کرتے ہیں' دلیل پیش کرتے ہیں۔

ارکان جماعت کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ پہلا موقع ہے جب بیلٹ پیپر جاری ہونے سے پہلے ہی منصبِ امارت کے لئے امیدواروں کا اعلان کر دیا گیا۔ قبل ازیں بیلٹ پیپر جاری کرنے سے پہلے امیدواروں کے نام افشاء کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امیدواروں کا تعین کرنے

کے لئے پچاس ساٹھ ارکان کے اجتماع میں ووٹنگ کرائی گئی۔ ان حضرات نے اس شبہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ امیدواروں کی ترتیب تبدیل کردی گئی۔ جماعت اسلامی کے ایک نائب امیر کے مقابلے میں اول امیدوار کو صرف ایک ووٹ کی برتری حاصل تھی' جب کہ دیگر امیدواروں کو اول امیدوار کے مقابلے میں زیادہ ووٹوں کی برتری حاصل تھی' اس طرح امیدواروں کی ترتیب ووٹوں کے حصول کے لحاظ سے ہی ہونی چاہئے تھی۔

جماعت اسلامی کے ارکان کے درمیان اختلافات کو بڑھانے میں "پاسبان" نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک طرف سے دعوٰی کیا جارہا ہے کہ یہ تنظیم جماعت اسلامی کی مجلس شورٰی کی منظوری سے وجود میں آئی ہے' دوسری جانب مجلس شورٰی کے ایک رکن کا کہنا ہے کہ جس اجلاس میں "پاسبان" قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی' اس میں یہ تجویز باقاعدہ منظور نہیں کی گئی تھی۔ بہرحال اس اختلاف سے قطع نظر بہت سے ارکان کا یہ کہنا ہے کہ قاضی حسین احمد صاحب نے گزشتہ کچھ عرصہ سے اپنی سرگرمیوں میں سے جس طرح سے "جماعت اسلامی" کو خارج کیا ہے' اس کی تصدیق اخباری اشتہارات' سڑکوں پر لگائے جانے والے بڑے ہورڈنگز اور بینروں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوجاتی ہے' جبکہ جماعت اسلامی کا دستور کہتا ہے کہ: "دفعہ ۱۷ (۲) جماعت کی دعوت اپنے عقیدہ اور نصب العین کی طرف ہوگی نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور امارت کی طرف۔" گزشتہ کچھ عرصہ سے جاری سرگرمیاں واضح طور پر دستور کی اس شق کے ساتھ متصادم ہیں۔

اب آیئے پاسبان کی طرف۔ اس سلسلے میں قیم جماعت اسلامی نے ۲۴ اپریل ۱۹۹۱ء کو بحوالہ ۳۔۱۲۔۵۔۸ جو سرکلر "پاسبان تنظیم ــــ اہم ہدایات" کے زیر عنوان جاری کیا تھا اور اس میں جو کچھ اس تنظیم کی تشکیل سے متعلق درج کیا گیا ہے اور جس طرح سے وہ امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد کی ذاتی تنظیم میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے' اسے بھی ارکانِ جماعت دستور کی خلاف ورزی پر مبنی قرار دے رہے ہیں۔ مثلاً دستورِ جماعت میں کہا گیا ہے کہ رکنِ جماعت بننے کا خواہش مند کوئی شخص دفعہ ۶ (۷) کے تحت "کسی ایسی جماعت یا ادارے سے تعلق نہ رکھتا ہو' جس کے اصول اور مقاصد جماعت اسلامی کے عقیدہ و نصب العین اور طریق کار کے خلاف ہوں"۔ نیز رکنِ جماعت بننے کے بعد وہ شخص دفعہ ۷ کے تحت اس امر کا اقرار کرے گا کہ: "ثالثاً اس نے دستور جماعت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور عہد کرتا ہے کہ دستور کے مطابق وہ نظام جماعت کا پوری طرح پابند رہے گا"۔

چوہدری محمد اسلم سلیمی کے جاری کردہ سرکلر میں جو کچھ کہا گیا ہے اگرچہ وہ بھی محلِ نظر ہے' لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ اس سرکلر کے الفاظ اور عمل کے درمیان کوئی

مطابقت موجود نہیں ہے۔ مثلاً "پاسبان" تنظیم کا ہر ذمہ دار یہ کہہ رہا ہے کہ ان کا جماعت اسلامی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' وہ اپنے اجتماعات میں قاضی حسین احمد کی موجودگی کے باوجود جماعت اسلامی کے کسی معروف رہنما' عہدیدار یا رکن اسمبلی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ اگر جماعت کا جھنڈا نظر آجائے تو کارکن سے چھین کر اسے لپیٹ دیتے ہیں۔ پھر نعرے ہیں' ترانے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کھلے عام اعلان کرتے ہیں کہ "پاکستان کے عوام کو سیاسی جماعتوں (بشمول جماعت اسلامی) نے باہم تقسیم کر رکھا ہے"۔ یوں اس تمام عمل کی نفی کرتے ہیں جو جماعت اسلامی کا شعار رہا ہے۔

اس سرکلر کا ایک قابل ذکر حصہ وہ ہے جس کا عنوان ہے "پاسبان کا نظام کیا ہوگا؟" اس کے مطابق: مجلس شوریٰ نے طے کیا ہے کہ:

(۱) پاسبان کا نظام بنیادی طور پر اصلاح معاشرہ کے لئے عملی کام کی بنیاد پر قائم ہو اور اسی کی بنیاد پر چلے' پاسبان عملی کام ہی کی صورت میں نظر آئے ورنہ جس مقام پر کام نہ ہو' وہ نہ وہاں قائم کی جائے نہ قائم رہ سکے۔

(۲) پاسبان میں شمولیت کا انحصار کاغذی کارروائی پر نہ ہو' بلکہ کام پر ہو۔ جو کوئی کچھ نہ کچھ' کسی نہ کسی نوعیت کا کام کرے وہ پاسبان شمار ہو۔

(۳) پاسبان کا قیام کسی سرکلر' ہدایت یا حکم کے تحت نہ ہو' بلکہ جہاں جہاں موزوں افراد میسر ہوں اور وہ کام شروع کردیں' وہاں پاسبان قائم کردی جائے/قائم ہوجائے۔ صرف عہدیداروں کے تقرر کو پاسبان کا قائم ہوجانا نہ سمجھا جائے۔

(۴) پاسبان کا کوئی سطح وار (مرکزی' صوبائی' ضلعی' تحصیلی' مقامی) تنظیمی ڈھانچہ نہ ہو' نہ سطح وار عہدیدار ہوں۔

(۵) پاسبان میں رپورٹوں کا نظام نہ ہو اور نہ جہاں تک ہوسکے دفتری نظام —— اس سے آگے یہ کہا گیا ہے کہ:

نظم جماعت سے پاسبان کے تعلق کو سمجھنے کے لئے' اسے ایک مرکزی شعبہ تصور کیا جاسکتا ہے' چنانچہ مرکزی شوریٰ نے طے کیا ہے کہ (۱) پاسبان براہ راست امیر جماعت کے ماتحت ہو۔

ارکان جماعت کے نزدیک متذکرہ بالا سطور کا سرسری مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ "پاسبان" ایک باقاعدہ تنظیم نہیں' صرف اور صرف افراد کا ہجوم ہوگا' جس کو امیر جماعت اسلامی کے مقرر کردہ "ذمہ دار" سنبھالیں گے۔ اس تنظیم کا جماعت اسلامی کے ساتھ تعلق "مشاورت' معاونت اور کوآرڈی نیشن کا ہوگا۔" گویا جماعت اسلامی پاسبان کے لئے مشاورت' معاونت اور کوآرڈی نیشن تو مہیا کرے گی' لیکن وہ اس کے ذمہ داران یا ارکان سے کوئی ایسا تقاضا پورا

کرنے کے لئے نہیں کہے گی جو اس کے اپنے ارکان کے لئے مخصوص ہے۔ ان ہدایات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس تنظیم میں انتخابات میں "نامزدگی" کی بنیاد پر "ذمہ داران" کا تعین ہوگا اور سب ارکان و ذمہ داران صرف اس ایک شخصیت امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد کے اشارہ پر حرکت کریں گے۔ پاسبان کے اس تنظیمی ڈھانچے کے مماثل صرف ایک جماعت وطن عزیز میں پہلے سے موجود ہے اور اس کا نام پیپلز پارٹی ہے' جس کی سربراہی بھٹو خاندان کے لئے وقف ہے۔ پھر ان کے نامزد عہدیدار ہیں اور اس کے بعد عوام کا ہجوم ہے' جس کے لئے باعث کشش صرف اور صرف بھٹو خاندان ہے۔ ارکانِ جماعت یہ سوال کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے بطن سے ایک اور پیپلز پارٹی نکالنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟

میاں طفیل محمد صاحب نے ایک مقامی جریدے کو اس سے مماثل ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ "پاسبان تنظیم کے ذریعے جماعت اسلامی نے اپنے مزاج اور طریقہ کار سے ہٹ کر اقتدار تک پہنچنے کا پروگرام بنایا ہے۔ میری دانست میں یہ طریقہ کار غیر دانش مندانہ ہے۔ جو اثاثہ مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے ۵۰ برس کی طویل جدوجہد میں اپنا خونِ جگر پلا پلا کر بنایا تھا' اس کا بہت بڑا حصہ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے' باقی کو اللہ محفوظ رکھے۔ جو جماعت قیام پاکستان سے لے کر اب تک نظریۂ پاکستان اور قرارداد مقاصد کی حفاظت کرتی آئی ہو' سیکولر اور سوشلسٹ عناصر کے سامنے دیوار بنی رہی ہو' اب ان ہی لوگوں کے راستے پر گامزن ہو جائے' تو اس سے کہاں بہتری ہوگی۔ میں کہتا ہوں جس طرح مصر' عراق' شام' ترکی اور الجزائر میں اسلامی تحریکوں کے خلاف بڑے بڑے حادثات برپا ہوئے اسی طرح کا ایک اور حادثہ پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے۔"

اردو بازار میں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیفات و تصانیف

درج ذیل دو مقامات سے دستیاب ہیں۔

اسلامی اکادمی، الفضل مارکیٹ' اردو بازار لاہور۔ فون: ۶۴۱۶۱ ۲

نعمانی کتب خانہ، حق سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور۔ فون: ۳۲۱۸۶۵

(مزید برآں شاہراہ قائد اعظم پر فیروز سنز کے شوروم میں بھی ہماری مطبوعات دستیاب ہیں)

"جماعتِ اسلامی کی پٹڑی بدل دی گئی ہے"

تحریکِ اسلامی کے بزرگ رہنما جناب نعیم صدیقی کا انٹرویو

(مرتب: نصراللہ غلزئی، شائع شدہ "تعمیر" ۲۴ ستمبر ۹۲ء)

س:۔ جماعت اسلامی آج کل جس کیفیت سے دوچار ہے' اس پر آپ کیا کہیں گے؟

ج:۔ جماعت اسلامی میں انتشار کی کیفیت واضح ہو چکی ہے۔ یہ انتشار کا شکار ہے' جو اس کے عملی اقدامات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ انتشار مولانا مودودیؒ کی وفات کے بعد مارشل لاء کے دور میں شروع ہوا کیونکہ مختلف النوع پابندیوں کے باعث جماعتی نظم پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ مختلف لیڈر اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے تھے' درپیش حالات کی وجہ سے ان کے خلاف سخت تادیبی اقدامات نہیں کیے جاسکے تھے لیکن یہ میاں طفیل محمد صاحب کا کمال تھا کہ انہوں نے ہر قسم کا دباؤ برداشت کیا اور جماعت اسلامی کو اس طوفان سے بچالیا۔

لیکن نئی امارت آنے کے بعد اس انتشار میں بے حساب اضافہ ہوا ہے کیونکہ ایسے بہت سے اقدامات ہونے لگے' ایسے بیانات اور قراردادیں سامنے آنے لگیں جو جماعت اسلامی کے دستور' تحریک اسلامی کے مزاج' معیار اخلاق اور جماعتی تشخص کے خلاف تھے۔ ان چیزوں نے اتنا زیادہ انتشار پیدا کیا جس سے ارکانِ جماعت میں مایوسی پیدا ہونے لگی' اس زمانے میں جو ڈاک مجھے ملتی تھی یا مرکز میں آتی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ارکانِ جماعت بے حد پریشان ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس صورتحال سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا علاج کیا جاتا' روز بروز ایسے اقدامات ہوتے چلے گئے جو دستور سے ٹکراتے تھے یا جماعت کے معروف مزاج سے۔ مولانا مودودیؒ کے ساتھ جو لوگ ابتداء میں اکٹھے ہوتے تھے وہ ایک خاص متعین منزل' ایک خاص راستے' ایک خاص سمت سفر کو ذہن میں رکھ کر اکٹھے ہوتے تھے' وہ سب یکسو تھے' لیکن اس نئے دور میں ڈرائیور کے بدلنے کے ساتھ ہی یہ محسوس ہوا کہ گاڑی اس پٹڑی کے بجائے ایک اور پٹڑی پر چل پڑی ہے۔ اس انتشار نے یہ نقصان بھی پہنچایا کہ بہت بڑی پستی کردار نے بھی جماعت میں راہ ڈھونڈلی ہے جو طویل بھی ہو رہی ہے اور وسیع بھی۔

س:۔ آپ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ جماعت اسلامی کی موجودہ قیادت کے بہت سے اقدامات

دستور کی خلاف ورزی پر مبنی ہیں' آپ اس سلسلے میں یہ نشاندہی کرنا پسند کریں گے کہ جماعت کے دستور کی کہاں کہاں خلاف ورزی ہو رہی ہے؟

ج:۔ میں صرف چند ایک مثالیں آپ کے سامنے رکھوں گا' مثلاً دستور کی دفعہ پانچ میں جماعت اسلامی کے مستقل طریقِ کار کا تعین کر دیا گیا ہے' جس کی شق (۳) میں درج یہ الفاظ قابلِ غور ہیں: "جماعت اپنے پیشِ نظر اصلاح اور انقلاب کے لئے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی۔ یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عامہ کو ان تغیرات کے لئے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیشِ نظر ہیں"

اسی طرح شرائطِ رکنیت کا معیار بھی مقرر کیا جا چکا ہے' لیکن ان دونوں معاملات میں موجودہ نظم بے حد ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ دستور کی دفعہ (۷) میں رکنِ جماعت کے متعلق کہا گیا ہے "کہ کسی ایسی جماعت یا ادارے سے تعلق نہ رکھتا ہو جس کے اصول اور مقاصد جماعت کے عقیدہ و نصب العین اور طریقۂ کار کے خلاف ہوں"۔ جماعت کے عہدیدار اور امیر کی ذمہ داری تو عام رکن کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے' لہٰذا اس شق کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

دستور کی دفعہ (۷) میں طریقِ داخلہ کے تحت جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ: "ثالثاً اس نے دستورِ جماعت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ عہد کرتا ہے کہ اس دستور کے مطابق وہ نظامِ جماعت کا پوری طرح سے پابند رہے گا"۔ اس شرط پر کس طرح سے عمل کیا جا رہا ہے اس کی ایک مثال ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سامنے آئی جب وہاں ایک اجتماع میں ایک صاحب کے متعلق بتایا گیا کہ وہ رکنیت کا حلف اٹھائیں گے' اس پر مرکز سے جانے والے ایک صاحب نے امیدوارِ رکنیت سے دریافت کیا کہ "کیا آپ نے دستور پڑھا ہے؟" جواب ملا ـــــ "جی ہاں ـــ میں نے ۱۹۷۳ء کا دستور پڑھ رکھا ہے' اس پر ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے جماعت کا دستور بھی پڑھا ہے؟ جواب ملا "کیا جماعت کا بھی کوئی دستور ہے؟" اس موقع پر مقامی امیرِ جماعت نے کہا کہ کوئی بات نہیں جماعت کا دستور یہ پھر پڑھ لیں گے' لیکن مرکز سے جانے والے صاحب نے انہیں حلف اٹھانے سے روک دیا۔

اسی طرح دستور کی دفعہ (۷) میں کہا گیا ہے کہ "اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو اقامتِ دین کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے سوا ان مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں"۔ لیکن اس دفعہ کی کھلی خلاف ورزی کی گئی۔ جماعتی عہدوں کے ساتھ بڑے بڑے کاروبار اور حصہ داریاں قائم کی

گئیں، حالانکہ دستورِ جماعت تو صرف "رزقِ کفاف" کی اجازت دیتا ہے۔

دستور کی دفعہ (۹) میں ہر رکن پر یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ اس کے لئے "لازم ہو گا کہ وہ اپنے حلقۂ تعارف میں اور جہاں تک پہنچ سکے، بندگانِ خدا کے سامنے بالعموم جماعت کے عقیدے اور نصب العین (جس کی تشریح دفعہ ۳-۴ میں کی گئی ہے) کو پیش کرے۔ جو لوگ اس عقیدے اور نصب العین کو قبول کرلیں، انہیں اقامتِ دین کے لئے منظم جدوجہد کرنے پر آمادہ کرے اور جو لوگ جدوجہد کرنے کے لئے تیار ہوں، انہیں جماعت اسلامی کے نظام میں شامل ہونے کی دعوت دے" —— مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کام تقریباً ٹھپ ہوچکا ہے۔ ارکانِ جماعت اب اس کام سے فارغ ہیں، حالانکہ یہی وہ راستہ تھا جس کو اختیار کرکے جماعت بنی تھی اور اسی پر چل کر اسے ترقی اور وسعت دی جاسکتی تھی۔

دستور کی دفعہ ۱۷ (ا) میں کہا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی پاکستان کا ایک امیر ہو گا جس کی حیثیت امیر المؤمنین (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی، بلکہ صرف اس جماعت کے امیر کی ہوگی۔ جماعت کے ارکان اس کی اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے"۔ لیکن اب ہو رہا ہے:

"آ قاضی تینوں اکھیاں اڈیک دیاں" (قاضی آ —— آنکھیں تیری منتظر ہیں)

دستور کی خلاف ورزی کے لئے دستور ہی کی دفعہ ۱۹ کو بھی استعمال کیا جارہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: "نظمِ جماعت اور تحریک کو چلانے کی آخری ذمہ داری امیرِ جماعت پر ہوگی اور وہ مجلسِ شوریٰ اور ارکان جماعت کے سامنے جوابدہ ہو گا۔" لیکن اس میں سے صرف پہلے حصہ پر اصرار کیا جارہا ہے اور اب جو کام بھی ہو رہا ہے وہ امیرِ جماعت کے حکم سے ہو رہا ہے۔ امیرِ جماعت کی آخری ذمہ داری کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے کسی اقدام کی مخالفت ارکانِ شوریٰ اکثریت سے بھی کریں تو وہ دستور کی اس شق کے صرف پہلے ٹکڑے کا حوالہ دے کر اپنا پسندیدہ کام کر گزرے اور مجلسِ شوریٰ اور ارکانِ جماعت کے سامنے جوابدہ بھی نہ ہو۔ اگر آخری ذمہ داری کا یہی مطلب ہے تو پھر کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وزیرِ اعظم جو ملکی نظم و ضبط کو چلانے کا آخری ذمہ دار ہے وہ پورے نظام کو ہی لپیٹ دے اور ہر کام اسی کی خواہش کے مطابق اور حکم کے تحت انجام دیا جائے۔ اس طرح سے دستور کی دفعہ ۱۹ کی کھلی خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ مولانا فتح محمد صاحب کو امیرِ جماعت اسلامی پنجاب کے عہدے سے ہٹانا اور امیرِ جماعت اسلامی لاہور کا تقرر اس سلسلے کی نمایاں مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا فتح محمد سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہمارے دو آدمی صوبائی مجلسِ شوریٰ میں شامل کرلو، انہوں نے یہ مسئلہ شوریٰ میں پیش کیا تو شوریٰ نے انکار کردیا۔ اس کے بعد شوریٰ سے کہا گیا کہ مولانا فتح محمد کے بجائے نیا امیر قبول کرلو۔ شوریٰ نے اس پر بھی انکار کردیا، جس کے بعد قاضی صاحب نے خود

صوبائی شوریٰ کو طلب کر لیا اور وہاں پر یہی مطالبہ کیا۔ بالآخر اس وقت دم لیا جب مولانا فتح محمد کو عہدۂ امارت سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے علاوہ عہدوں کے چناؤ، بیت المال اور خصوصی فنڈز کے معاملات بھی ایسے ہیں جن میں ارکانِ جماعت کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، آمد و خرچ کا پیمانہ یکلخت اتنا بلند ہوگیا ہے کہ اس کی توضیح کی ضرورت ہے۔

یہ سب کچھ اس حوالے سے کیا جارہا ہے کہ عوام میں اثر و نفوذ بڑھایا جائے، حالانکہ مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ آپ کو: "قلم، زبان یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ان کے ریوڑ آپ کے پاس آجائیں اور آپ انہیں ہانکتے پھریں۔ آپ کو ان میں حقیقتِ اسلامی کی معرفت پیدا کرنی چاہئے۔ لوگوں کے اندر گہری تبدیلی ساحری اور شاعری سے پیدا نہیں ہوا کرتی ـــــــ جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو راہِ راست سے نہ ہٹنے دیا جائے۔ اس میں غلط خیالات اور غلط طریقوں کے پھیلنے کو روکا جائے۔ اس میں نفسیاتی دھڑے بندیاں نہ پیدا ہونے دی جائیں۔ اس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے، اس میں کسی دنیوی غرض یا کسی شخصیت کو بت نہ بننے دیا جائے اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے"۔

س:۔ "پاسبان" نے جماعت اسلامی کے اندر اور باہر ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا ہے، آپ کی رائے اس ضمن میں کیا ہے؟

ج:۔ امیرِ جماعت اسلامی کے اقدامات کے ضمن میں پہلا اضطراب خلیجی جنگ کے موقع پر پیدا ہوا تھا۔ اس کی ابھی پوری طرح سے صفائی نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا اضطراب "پاسبان" کے اٹھانے سے پیدا ہوگیا۔ اس پر جب شروع شروع میں گرفت کی گئی تو جواب دیا گیا کہ اس کا جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور اب امیرِ جماعت اس کے سرپرست ہیں، بلکہ چیئرمین بھی کہلاتے ہیں۔ اس تنظیم کے لئے جماعت کے آدمی اور وسائل استعمال کئے جارہے ہیں۔ اب ان کے حامیوں نے یہ صفائی دینا شروع کی ہے کہ پاسبان جماعت کے خلاف نہیں بلکہ عوامی رابطے کی ایک ذیلی تحریک ہے، جیسی کہ دیگر پیشہ ورانہ طلباء تنظیمیں ہیں۔

اس میں اول غلطی تو یہ ہے کہ پیشہ ورانہ تنظیم نہیں ہے، دوئم یہ کہ یہ پیشہ ورانہ تنظیموں کا تجربہ نہایت افسوسناک ہے۔ مثلاً پنجاب میں ہمارا ایک وزیر ٹرانسپورٹ تھا اور وہاں یونین بھی ہماری ہی تھی، لیکن ان دونوں کے درمیان تصادم ہوگیا اور ہم اس کو نہ روک سکے، دونوں میں کسی کو بھی سمجھا بجھا نہ سکے، لہٰذا یہ گارنٹی نہیں مل سکتی کہ ذیلی تنظیم کسی ضرورت اور موقع پر آپ کی توقع کے مطابق ہی چلے گی۔ مزید بر آں پاسبان کی بھرتی آزاد اور کھلی ہے۔ کوئی شرط نہیں، عقیدہ کی کوئی پابندی نہیں۔ قادیانی ہو یا اسماعیلی، موحّد ہو یا ملحد، امریکی ایجنٹ ہو یا "را" کا کارندہ، سب کے لئے اس کے دروازے کھلے ہیں۔ کچھ عرصہ تک تو یہ ہاؤ ہو چل

سکتے ہیں' لیکن اس کے بعد جب یہ عملاً طاقت بن جائیں گے' تو عین ممکن ہے کہ یکایک تصادم کی کیفیت پیدا ہوجائے یا یہ کہ ہمارے مقابلے میں عوامی نفسیات کا کوئی بڑا ماہر یا کوئی جادوگر صرف ایک تقریر سے انہیں اپنے ساتھ بہالے جائے' جیسا کہ کشمیر میں ہوا۔ لبریشن فرنٹ نے ایک زلزلہ پیدا کردیا --- دوسری جانب یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص' جس کی ایک نہایت دین دار بیوی ہو وہ ایک ایسی عورت سے نکاح کرلے' جو نہایت رنگین مزاج ہو' کسی پابندی کو خاطر میں نہ لاتی ہو' اور وہ شخص یہ بھی کہے کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ گوردوارہ پربندھک کمیٹی اور جمعیت علماء کا صدر ایک ہی شخص ہو۔ جب یہ نہیں ہو سکتا تو پھر خواہ مخواہ کی دلیل بازی اور تمثیل سازی سے کیا فائدہ --- جہاں تک تحریک اسلامی کا تعلق ہے' تو تمام انبیاءؑ کا ریکارڈ قرآن پاک میں محفوظ اور ہمارے سامنے ہے --- جنابِ والا' طریقِ انبیاءؑ سے ہٹ کر جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ باطل ہے۔ مولانا مودودیؒ نے کہا کہ:

"اصل بات یہ ہے کہ اسلامی انقلاب اس وقت تک مضبوط جڑوں سے قائم نہیں ہو سکتا' جب تک لوگوں کے خیالات تبدیل نہ کردیئے جائیں' جب تک لوگوں کے افکار' لوگوں کے اخلاق' لوگوں کی عادات کو تبدیل نہ کر دیا جائے۔ اگر کسی قسم کے تشدد کے ساتھ یا کسی قسم کی سازشوں کے ساتھ یا کسی قسم کی دھوکے بازیوں کے ساتھ اور جھوٹ اور اسی طرح کی مہم کے ساتھ انتخابات جیت بھی لئے جائیں یا کسی طریقے سے انقلاب برپا کر بھی دیا جائے' تو چاہے یہ انقلاب کتنی دیر تک رہے یہ اس طرح اکھڑتا ہے' جیسے اس کی کوئی جڑ ہی نہ ہو---"

اس طرح کی چیزوں کے بارے میں جب کبھی مولانا مودودیؒ کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ صحیح راہ یہ تھی' تو ایسا کرنا بھی بالعموم ناگوار گزرتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ "مولانا کا دور تو گزرگیا"۔ ہمارے پاس قرآن و سنت موجود ہے' ہم خود سوچ سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ وہ انسان ہیں جنہوں نے دائرہ عمل میں آنے سے پہلے کئی برس تک اس کی تیاری کی تھی' اس طرح کا کوئی دوسرا لیڈر ہمیں نظر نہیں آتا۔ وہ جدید اور قدیم علوم کے شناور تھے۔ اس کا ریکارڈ آبادشاہ پوری کی کتاب "جماعت اسلامی کی تاریخ حصہ اول" میں محفوظ ہے' یہ ایسی ہی بات ہے جو کوئی بھی کسی دوسرے شخص سے کہہ سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کی بات اور طور طریق اگر آج نہیں چل سکتے' تو پھر آپ کی بات کب تک چلے گی!

س:۔ پاسبان میں شامل بہت سے نوجوان یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ "جماعت اسلامی کی قیادت نے ہمارے پچاس سال ضائع کردیئے' کیا ان کا یہ کہنا درست ہے؟

ج:۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک شخص تو پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرے اور دوسرا ناخواندہ شخص

دوبئی جائے اور وہاں سے دولت کما کر مکان کھڑا کرے اور پھر یہ کہے کہ اس نے پی ایچ ڈی کر کے اپنی زندگی ضائع کردی۔ دراصل طویل المدت عمل ہی انسانی معاشروں کو تبدیل کرتا ہے، تعلیم و تربیت کا کام برسہابرس تک کرنا پڑتا ہے، مولانا مودودیؒ نے یہی کیا۔ اس کے باوجود کمی رہی، اگر یہ کمی نہ رہتی تو آج صورتِ حال ہی مختلف ہوتی، لیکن اس کے باوجود یہ معاملہ ایسا ہی ہے کہ اگر کسی فوج کو سو برس تک لڑائی پیش نہ آئے، تو کوئی شخص اٹھ کر یہ کہہ دے کہ اس تمام عرصے میں فوج پر اٹھنے والے تمام اخراجات ضائع ہوگئے۔ اسے تعمیر کرنے کی تمام کوششیں اکارت گئیں۔ اس قسم کی باتوں کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے، کسی نے انہیں یہ باتیں سکھائی ہیں تو بہت غلط کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ سے بھی ایک مرتبہ ایسی ہی بات کہی گئی تھی، جس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ:

"جماعت اسلامی اس قسم کا تجربہ نہیں کرنا چاہتی، ہم یہ چاہتے ہیں کہ چاہے سو برس لگ جائیں، لیکن قوم کے ذہن کو تبدیل کیا جائے، اس کی سیرت کو تبدیل کیا جائے اور اس کو اس حد تک تیار کیا جائے کہ وہ اسلامی نظام کا بوجھ سہار سکے، اس اسلامی نظام کو چلانے کے قابل ہوسکے"۔

س:۔ میاں طفیل محمد صاحب کے استعفیٰ کے بارے میں قاضی حسین احمد کا بیان ۳ ستمبر کے نوائے وقت میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے اسے محض "پروپیگنڈا" قرار دیا ہے، آپ کی معلومات اس سلسلے میں کیا ہیں؟

ج:۔ اس بارے میں، میں بھی اور بطور اخبار نویس آپ بھی حقائق سے باخبر ہیں کہ یہ بیانات کس طرح سے آئے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میاں صاحب کے استعفیٰ کی خبر شائع ہونے کے بعد قیم جماعت اسلم سلیمی صاحب، میاں صاحب کے پاس آئے اور انہوں نے تردیدی بیان لینے کی کوشش کی، جب ایسا نہ ہوا تو انہوں نے جو بات چیت کی اس کی بنیاد پر ایک بیان اخبارات کو جاری کردیا گیا۔ اگر یہ پروپیگنڈا تھا، تو جناب اسلم سلیمی میاں صاحب کے پاس کیوں آئے؟ اس کے باوجود اگر اسے پروپیگنڈا کہہ کر ہی مسترد کرنا ہے، تو پھر کوئی دوسرا شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ قاضی صاحب نے کہا وہ پروپیگنڈا ہے ـــــ اور پھر کیا یہ بھی پروپیگنڈا ہے کہ فیصل آباد میں مجلس شوریٰ کے انتخابات میں دھاندلی کرنے کے الزامات ثابت ہونے کے بعد تین ارکان کو جماعت اسلامی سے خارج کر دیا گیا ہے اور تین کی بنیادی رکنیت معطل کردی گئی ہے۔ خارج کئے جانے والوں میں مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن اور سابق امیرِ ضلع رانا انور طاہر، حاجی عبدالکریم اور ناظم دفتر نور احمد شہباز اور معطل ہونے والوں میں امیرِ ضلع چوہدری محمد یعقوب، جنرل سیکرٹری اسد اللہ لطیف اور امیر ڈچکوٹ فقیر حسین شاہ شامل

ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اخلاقی حالت، سیاست بازی اور دین سے غفلت کی وجہ سے اس حد تک گر چکی ہے کہ کھلم کھلا کنوینگ سے لے کر انتخابات میں دھاندلی تک وہ تمام بدترین حرکات ہم کرنے لگے ہیں، جو خدا نا آشنا لوگ کرتے رہے ہیں۔

س:۔ جماعت اسلامی کے معاملات یا اقدامات کے بارے میں اگر کہا جائے یا لکھا جائے، تو فوراً یہ آواز بلند ہونے لگتی ہے کہ "قاضی صاحب کے خلاف سازش کی جارہی ہے"۔ آپ اس ضمن میں کیا کہیں گے؟

ج:۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ شوشہ سب سے پہلے جسارت میں شاہد ہاشمی صاحب نے چھوڑا تھا، جس کے متعلق ایک تفصیلی خط میں نے مدیر جسارت کو لکھا تھا، دوسری بار یہ بات اس شکل میں سامنے آئی ہے کہ مختلف اعلیٰ افسر اور مختلف عالمی طاقتیں قاضی صاحب کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قاضی صاحب کے محب شاید یہ سمجھتے ہیں کہ لیڈروں کے متعلق اگر قاتلانہ حملوں اور سازشوں کی خبریں شائع کی جاتی رہیں تو انہیں اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ ایک طرف تو وہ مظلوم بن جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے متعلق یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ بعض عناصر اور طاقتیں انہیں منظرِ عام سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، ماسوا اس کے کہ اس کا اثر امیرِ جماعت اسلامی کے انتخاب پر پڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سو افراد کی معیت میں دورۂ پنجاب یہ تاثر دینے کی معقولیت کو از خود واضح کر دیتا ہے۔

ضرورت رشتہ

کراچی میں مقیم بدایوں (یوپی) سے تعلق رکھنے والے خاندان کے درج ذیل افراد کے لئے دینی مزاج رکھنے والے گھرانوں سے رشتے مطلوب ہیں

(۱) لڑکا، عمر ۲۸ سال، گریجویٹ، برسرروزگار، (۲) لڑکی، طالبہ بی اے فائنل، عمر ۲۴ سال، ۳) لڑکی، طالبہ انٹر کلاس، عمر ۱۹ سال

رابطہ، معرفت نسیم الدین صاحب،

۱۱۔ داؤد منزل، شاہراہ لیاقت، کراچی

لاہور میں مقیم ارائیں فیملی کی ۲۴ سال دوشیزہ، تعلیم بی اے، کے لئے دینی مزاج کے حامل گھرانے سے رشتہ مطلوب ہے۔ لاہور اور قرب و جوار سے تعلق رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

حاجی چوہدری محمد سراج الحق،

انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بنک آف پاکستان، ۹۔ ڈیوس روڈ، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: ۸۵۶۰۰۳

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی

کوڈ نمبر		اشاعتِ خاص	اشاعتِ عام
BU-1-1	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	10.00	6.00
BU-1-2	راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	30.00	10.00
BU-1-3	مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	30.00	•
BU-1-4	قرآن اور امن عالم		3.00
BU-1-5	جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ	12.00	
BU-1-6	قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	40.00	20.00
BU-1-7	قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں (قرآن مجید کے حقوق کی تلخیص)		3.00
BU-1-8	عظمت قرآن	7.00	4.00

اسلامی انقلاب

BU-6-1	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	20.00	10.00
BU-6-2	منہج انقلاب نبوی	60.00	30.00
BU-6-3	اسلامی انقلاب کے لئے التزام جماعت اور لزوم بیعت		10.00

سنت و سیرت

کوڈ نمبر		اشاعتِ خاص	اشاعتِ عام
BU-2-1	رسولِ کاملؐ	16.00	7.00
BU-2-2	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	7.00	4.00
BU-2-3	اسوۂ رسولؐ	18.00	8.00
BU-2-4	معراج النبیؐ		4.00
BU-2-5*	شہیدِ مظلومؓ	10.00	5.00
BU-2-6	سانحۂ کربلا	6.00	3.00

حقیقتِ دین

کوڈ نمبر		اشاعتِ خاص	اشاعتِ عام
BU-3-1	توحیدِ عملی		20.00
BU-3-2	عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی	6.00	
BU-3-3	عظمتِ صوم	5.00	3.00
BU-3-4	عظمت صیام و قیام اللیل		5.00

فرائضِ دینی

کوڈ نمبر		اشاعتِ خاص	اشاعتِ عام
BU-7-1	دعوتِ الی اللہ		3.00
BU-7-2	قربِ الٰہی کے دو مراتب	10.00	5.00
BU-7-3	فرائضِ دینی کا جامع تصور		3.00
BU-7-4	تنظیمِ اسلامی کی دعوت	6.00	
BU-7-5	امتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل	45.00	15.00
BU-7-6	حب رسولؐ اور اس کے تقاضے		3.00

احیاء اسلام اور اسلامی تحریکیں

		اشاعت خاص	اشاعت عام
BU-5-1	اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام	5.00	
BU-5-2	دعوت رجوع الی القرآن	80.00	60.00
BU-5-3	تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر		6.00
BU-5-4	تحریک جماعت اسلامی (ایک تحقیقی مطالعہ)	40.00	20.00
BU-5-5	تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب	80.00	35.00
BU-5-6	عزم تنظیم (سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر۱)		7.00
BU-5-7	جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی		60.00
BU-5-8	قافلۂ تنظیم منزل بہ منزل	8.00	
BU-5-9	تعارف تنظیم اسلامی (سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر۳)		7.00
BU-5-10	ہیئت تنظیمی اور نظام العمل (سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر۴)		5.00

ملّت و سیاست

		اشاعت خاص	اشاعت عام
BU-8-1	اسلام اور پاکستان	40.00	20.00
BU-8-2	استحکام پاکستان	50.00	30.00
BU-8-3	استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ	20.00	
BU-8-4	علامہ اقبال اور ہم		
BU-8-5	شمالی امریکہ میں مسلمانوں کا حال و مستقبل		6.00
BU-8-6	پاکستان میں نظام خلافت		5.00

ہم مغرب سے مقابلہ کرتے ہیں

....اور اُن ہی کی سرزمین پر!

ہم اپنے گارمنٹس بیڈلنن اور ٹیکسٹائل کی دیگر مصنوعات مغربی ممالک، اسکینڈی نیوین ممالک، شمالی امریکہ روس اور مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور ہماری برآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن بیرونی منڈیوں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہمیں انتھک محنت کرکے اپنی فنی مہارت اور معلومات میں مستقل اضافہ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ ایسی محنت جو ہمیں ترک کر دم نہیں لینے دیتی ایسی محنت جو ہماری کارکردگی کے معیار کو اور بلند کرتی ہے، ایسی محنت جو کوالٹی ڈیزائن اور پابندیٔ وقت کے سلسلے میں کرم فرماؤں کے مطالبات اطمینان بخش طریقے پر پورا کرنے کا ہمیں اہل بناتی ہے۔

Made in Pakistan
Registered Trade Mark

Jawad®

جہاں شرط مہارت
وہاں جیت ہماری

معیاری گارمنٹس تیار کرنے اور برآمد کرنے والے

ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز (گارمنٹس) پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

IV/C/3-A ناظم آباد، کراچی - 18 - پاکستان - فون 610220-616018-628209
کیبل "JAWADSONS" ٹیلیکس 24555 JAWAD PK فیکس 610522 (92-21)

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO.L 7360
VOL . 41 NO . 10
OCT. 1992

انسٹنٹ
جوھر جوشاندہ

فلو، نزلہ، زکام اور گلے کی سوزش
کے لیے مفید

صدیوں سے آزمودہ **جوشاندہ** اب فوری حل ہونے والے
انسٹنٹ **جوھر جوشاندہ** کی شکل میں۔
خاندان کے ہر فرد کے لیے مفید **جوھر جوشاندہ** فلو، نزلہ،
زکام کی علامات میں آرام پہنچاتا ہے۔
موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے **جوھر جوشاندہ**
احتیاطی تدبیر کے طور پر استعمال کریں۔
ترکیب استعمال: ایک کپ گرم پانی یا چائے میں ایک پیکٹ
جوھر جوشاندہ ملائیں اور جوشاندہ تیار
دن میں دو یا تین پیکٹ **جوھر جوشاندہ** استعمال کریں

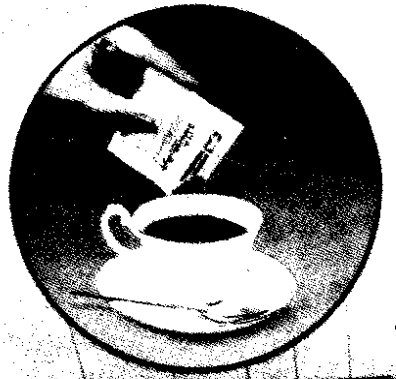

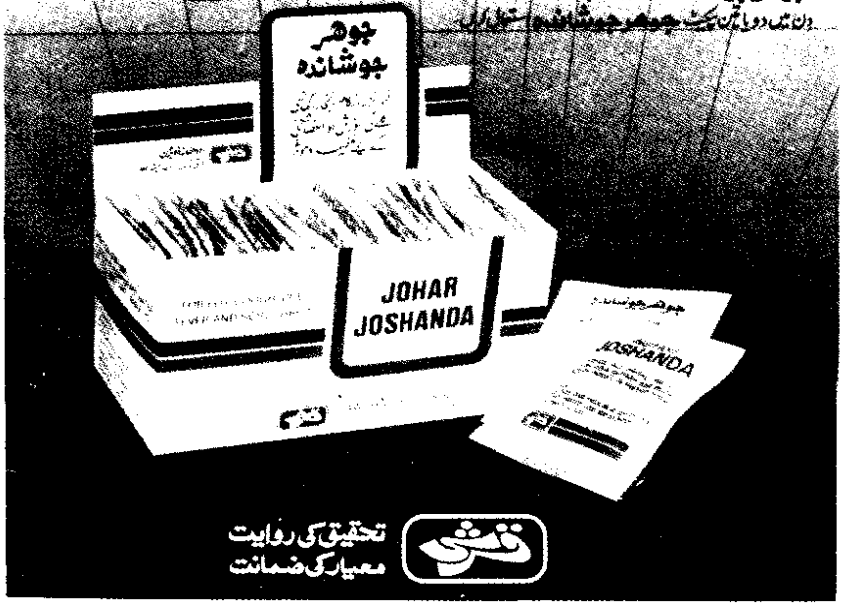

تحقیق کی روایت
معیار کی ضمانت
قرشی